معظم

محمد طفیل

مُعظّم

محمد طفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو، لاہور

باراوّل	نومبر ۱۹۷۴ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	دس روپے
کتابت	عبدالمتین

محمد طفیل، پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کی

ترتیب

حرفے چند

یہ مضامین جس ترتیب سے لکھے گئے۔ اُسی ترتیب سے حاضر ہیں۔

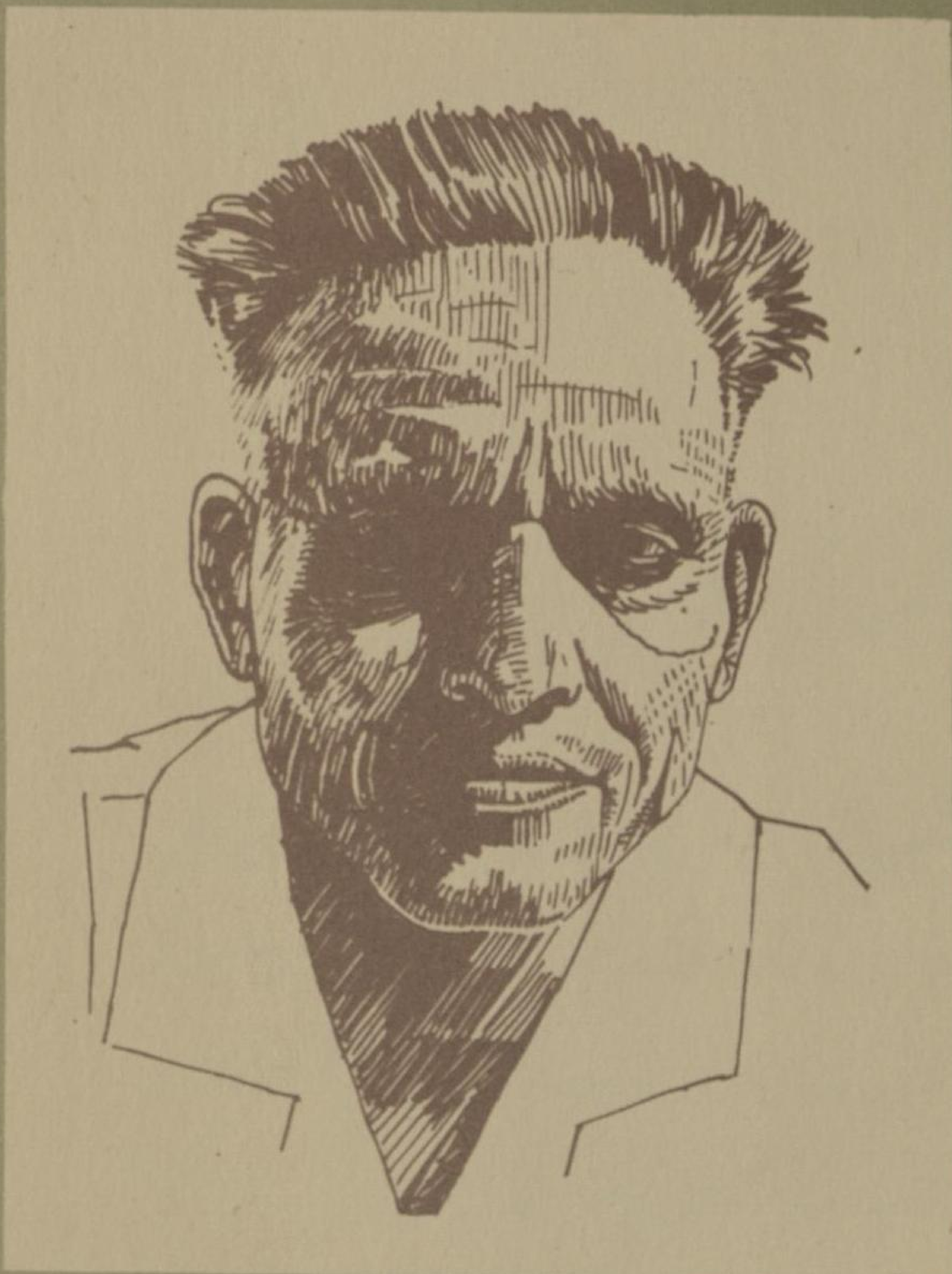
اس کتاب کے کچھ مضامین طویل ہیں اور کچھ مختصر، طویل مضامین کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جامع ہیں اور مختصر مضامین کے معنی یہ نہیں کہ وہ نامکمل ہیں ۔ میری گرفت میں، جو شخصیّت جتنے صفحات میں آئی۔ میں نے اُتنے ہی صفحات لکھ ڈالے۔ ہر شخصیّت کے بارے میں، میری نیّت نیک اور ایک سہی، پھر بھی تحریری پینترے قدرے مختلف ہیں۔ جو شخص جس شیشے میں اُتر سکتا تھا۔ میں نے اُسے اُسی شیشے میں اُتارا !

باقی رہا معاملہ معیار کا، اس سلسلے میں میری گذارش یہ ہے کہ جیسے بُرے بھلے خاکے، قبل ازیں لکھ چکا ہوں۔ کچھ ویسے ہی یہ بھی ہیں۔ نہ تو میں پہلی کتابوں پر اترایا تھا اور نہ اس پر شرمندہ ہوں۔ میرا کام تو صرف لکھنا ہے۔ ردّ و قبول کا معاملہ آپ کے اخلاق کا معاملہ ہے۔

یہ میری چھٹی کتاب ہے۔ یعنی اس سے پہلے میرے ذہن پر پانچ پہاڑوں کا بوجھ ہے۔ ساتھ ہی میرے قلم پر، متعدد شخصیتوں کے گناہ —— اور الزام ! گناہ میرے —— الزام دوسروں کے !

محمد طفیل

۱۰ مارچ ۱۹۷۴ء



ممتاز مفتی

میں نے آج تک جتنے مضمون لکھے۔ اُن میں کچھ نہ کچھ ممدوحین کی خوشنودیٔ طبع کا بھی خیال رکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یاروں نے کہا۔ خاکہ کیا لکھا، خاک اُڑا دی۔ آج جب کہ میں ممتاز مفتی پر اپنے تاثرات پیش کرنے چلا ہوں تو میرے قلم پر کسی قسم کا خوف طاری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے غلافی حروف کے سہاروں کی ضرورت نہ ہوگی۔

پہلی بات تو یہ ہوئی کہ مفتی صاحب ریاکار نہیں۔ کھری باتیں کرتے ہیں۔ کھری باتیں سنتے ہیں قبل اسکے کہ میں یادوں کی شمع روشن کروں۔ کیوں نہ پہلے انہیں اپنی ہی تحریروں میں پڑھا جائے تاکہ شبیہہ کشی میں مستند ہے میرا فرمایا ہوا کی نہ صرف جھلک ہو بلکہ چھنک بھی ہو۔

"علی پور کا ایلی" ان کی اپنی سوانح ہے کہ نہیں، اس پر دونوں طرح کی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں "ہے" یہ کہتے ہیں "نہیں"۔ لیکن ان کی اپنی ہی ایک تحریر اقبالِ جرم کرلیتی ہے [1]

---

[1] بہرحال اُردو ادب میں کوئی طویل کہانی ایسی نہ ملے گی جس کی تفصیلات براہِ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور چناؤ کیے بغیر ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہوں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ بیتی ہے۔

اب بات یوں ہوئی کہ مفتی کی ایک شخصیت وہ ہوئی جو کتاب میں بند ہے اور ایک وہ ہوئی جو گوشت پوست کی صورت میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ ایک طرف بارہ سو صفحات ہیں۔ دوسری طرف پانچ فٹ چار انچ کا انسان، ان میں سے کس طرف دیکھوں؟ تاکہ مضمون گونگے کا سپنا نہ بنے؟

اگر میں "علی پور کا ایلی" کے اوراق کھول کے بیٹھ گیا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ سطر سطر متوجہ کرے گی اور میرا مضمون چوپٹ ہو جائے گا۔ میری رائے تو یہی ہو گی کہ کتاب کو لفظ بہ لفظ پڑھا جائے اگر اچھی تحریریں پڑھنے کے لیے آپ کے پاس وقت نہ ہو تو کم از کم اسے چند ایک جگہوں سے الٹ پلٹ کر ضرور دیکھ لیں۔ اتنے پر بھی مفتی کی شخصیت کے مختلف روپ اجاگر ہو جائیں گے۔ ان میں بھی آپ کو مفتی کی معصومیت، ان کا گھریلو ماحول، ان کے احساسات و محسوسات، ان کی محبت کے مختلف پہلو، ان کی جنس زدگی، ان کا احساسِ کمتری، حتیٰ کہ چہرے مہرے تک کے خطوط بھی نظر آجائیں گے۔

آیئے پہلے مفتی کی ڈائری میں سے ایک صفحہ پڑھیں۔ اس ایک صفحہ سے پورے مفتی تو نہیں مگر ایک چوتھائی ضرور سامنے آجائیں گے۔

"سند باد جہازی کی طرح میرے کندھوں پر بچپن کا بڈھا سوار ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ لوگ اس بھید سے واقف ہو چکے ہیں اور مجھ پہ ہنستے ہیں۔ مدت تک میں کوشاں رہا کہ لوگ مجھے ایک سنجیدہ آدمی سمجھیں اور مناسب اہمیت دیں۔ اس مسلسل کوشش کا صرف یہی اثر ہوا کہ میرے ماتھے پر ایک تیوری ابھر آئی اور اب میں اسے

مٹانے کی ناکام کوشش میں لگا رہتا ہوں۔

میری طبیعت بے ہنگم، بے لگام اور بے صبر ہے۔ اس میں روانی نہیں، ضبط نہیں۔ میری طبیعت میں بنیادی طور پر جو جذبہ کارفرما ہے۔ وہ جھجک اور کمتری ہے۔ مجھ پر باقاعدہ چلنے کی اہلیت نہیں۔ ہاں کبھی کبھی بدک کر بے تحاشا دوڑ پڑتا ہوں۔

میری طبیعت پر عورت کا عنصر وضاحت کے ساتھ غالب ہے۔

اگر میرا ذہن ایک پکّی سڑک ہے تو دل ایک اُلجھی ہوئی پگڈنڈی، دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ جس کی وجہ سے میری طبیعت میں توازن نہیں، ربط نہیں، سکون نہیں، ہر گھڑی ایک کش مکش سی رہتی ہے۔

میں بے حد ڈرپوک اور بسا اوقات اِس خوف سے کہ میرا پول نہ کھُل جائے احمقانہ دلیری کے کام کر دکھاتا ہوں۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں اور اسی لیے اس کی شان میں گستاخی کرنے سے مجھے تسکین ملتی ہے۔

دل ہی دل میں دنیا سے ازحد خائف ہوں اور اس بات پر مجھے اپنے اُوپر غصّہ آتا ہے۔ چنانچہ میں قطعی بے پروا ہو کر دنیاداری کو انتقاماً ایک عظیم گناہ سمجھتا ہوں۔

بلندیوں سے اس قدر ڈرتا ہوں کہ اگر مجھے کسی اُونچی چٹان پر بٹھا دیا جائے تو میں اس ڈر سے بچنے کے لیے کہ گر نہ پڑوں، خود ہی اپنے آپ کو نیچے گرا دیتا ہوں۔

عورت سے ڈرتا ہوں۔ اس لیے اس کی طرف کھنچا جاتا ہوں۔ عشق ہو جائے، تو محبوب کو ملنے کی بجائے میری خواہش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو فنا کر دوں۔ میری محبّت کی گاڑی شک اور کمتری کے پہیّوں پر چلتی ہے۔ محبوبہ کے نقاب کا ہر تار مجھے اُبھرا ہوا

دکھائی دیتا ہے۔

مجھے کنواری لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی مٹیار کی ایک مستغنی نظر پر دوشیزگی، نوخیزی، معصومیت اور الہڑپن تج دینے کو تیار ہوں۔ مجھے بدمعاش عورت سے عشق ہے۔

میرا ذہن قومی، مذہبی، خاندانی اور رسمی تعصبات سے خالی ہے۔ عزت اور خودداری کے جذبات سے قطعی کورا ہوں۔"

میں نے اوپر لکھا تھا کہ ڈائری کے ایک ورق سے، مفتی کی کم از کم چوتھائی شخصیت سامنے آجائے گی اب میرا خیال یہ ہے کہ نہیں، مفتی تو اس ایک ورق میں سالم کے سالم موجود ہیں۔ مزید کچھ لکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ محض اپنے تعلقات کی نمائش کے لیے کچھ اور لکھا جائے تو وہ مسئلہ الگ ہے۔[۱]

کیا آپ نے میری طرح یہ بات نوٹ کی ہے کہ مفتی آدمی نہیں تضادات کے بادشاہ ہیں۔ ہے کو نہیں، نہیں کو ہے بنانے والے، اگر آپ نے اس نکتے کو جان لیا تو میں سمجھوں گا ہم نے مفتی کو بڑی حد تک پہچان لیا۔ صرف اتنی بات بھی نہیں، مزید غور پر، یہ بڑے ہی پیارے مگر ٹیڑھے آدمی ثابت ہوں گے اور ان کے ٹیڑھ پن کو قلم کی آنکھ سے دکھا دینا کارے دارد! آیئے پہلے ان کی تضاد روی پر غور کریں۔ کیسے کیسے چکر دیتے ہیں یہ، جیسے ہماری سُدھ بُدھ کے دشمن ہوں۔ مثلاً

"میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ اسی لیے اس کی شان میں گستاخی کرنے سے مجھے تسکین ملتی ہے۔"

---

[۱] پہلا ورق یہ بھی ہے —— پیدائش ۱۱ ستمبر ۱۹۰۵ء بمقام بٹالہ

"میں بے حد ڈرپوک ہوں۔ بسا اوقات اس خوف سے کہ میرا پول نہ کھل جائے احمقانہ دلیری کے کام کر دکھاتا ہوں۔"

"عورت سے ڈرتا ہوں۔ اس لیے اس کی طرف کھنچا جاتا ہوں۔"

"عشق ہو جائے تو محبوب کو ملنے کی بجائے میری خواہش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو فنا کر دوں۔"

ہیں نا مفتی کی سوچیں، گمانِ خبط میں مبتلا کر دینے والی سوچیں گے تو سوچتے ہی رہ جائیں گے ویسے مجھے اس ایک ورق کے سلسلے میں، آپ کے ذہن میں ایک دو باتیں محفوظ رکھوانی ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے آخر میں جو لکھا ہے کہ مجھے قومی اور مذہبی قسم کے جذبات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ چونکہ انہوں نے یہ بات ۱۹۲۵ء میں کہی تھی اور اس پر ۲۵ برس کی گرد پڑ چکی ہے۔ اب اگر اسے جھاڑ پونچھ کے دیکھیں گے تو مفتی کو بدلا ہوا پائیں گے۔ گواہی آئندہ صفحات دیں گے۔ بشرطیکہ کچھ کہا جا سکا!

ممتاز مفتی کے بارے میں میرا جم کر لکھنے کو جی چاہتا ہے مگر میرا یہ ارادہ بھی کئی اچھے ارادوں کی طرح پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ تحریر کا عجز ہے یہ یا تعلقات کی ڈوری میں کوتاہی یا یہ کہ مفتی کی شخصیّت ہے ہی گنجلک؟

اچھے ارادے کیوں پورے نہیں ہوتے؟ اس پر میں نے اکثر سوچا ہے۔ تن کی دُنیا سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ صرف من کا شیطان ہنس کے رہ جاتا ہے۔ ہی ہی ہی! ۔ شیطان سے جتنا واقف میں ہوں اُس سے زیادہ مفتی ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ انکی

شیطان سے اچھی خاصی دوستی ہے۔ اگر دوستی نہ ہوتی تو ان کے ساتھی (افسانوی کردار) اتنے چلتر نہ ہوتے۔ اتنے نٹ کھٹ نہ ہوتے۔ اتنے فتنۂ خوابیدہ نہ ہوتے۔ وہی بات ولی را ولی می شناسد!

کئی شرافت کے ٹھیکیداران کی تحریروں پر لاحول بھی پڑھتے ہیں حالانکہ یہ بنے ہوئے "شرافتیوں" سے زیادہ شریف ہیں۔ کیوں کہ یہ جانتے ہیں کہ تحریری دلداری بھی جگر فگاروں سے رکھنا ایک طرح کی عبادت ہے۔ جگر فگار؟ جی ہاں! وہی انسان جن کی باتیں مفتی کرتے ہیں۔ دوسرے کچھ چسکا انہیں تحریر کی مٹھاس کا بھی ہے۔

یہ اپنی خامیوں کا تذکرہ برملا کرتے رہتے ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ اپنی اُن خامیوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جو ان میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ طرزِ گفتگو کی دلآویزی کے لیے نہیں بلکہ عجز بندگی کے لیے، غرض یہ بندۂ خدا جو کچھ اپنی زبان سے کہتا رہتا ہے اُسے اگر کوئی بااختیار شخص سُن لے تو انہیں اچھی خاصی قید بامشقت تک کی سزا ہو سکتی ہے۔ غرض ان کا اپنے خلاف محاذ بڑا مضبوط ہے۔ اتنا مضبوط کہ خانہ خدا میں بھی جاکر اپنی اس حرکت سے باز نہیں آتے، قدرت اللہ شہاب اور مفتی مسجد نبوی میں بیٹھے ہیں۔ مکالمہ جاری ہے۔ مفتی کہہ رہے ہیں:۔

"اس مقدّس سرزمین سے کچھ لے کر جانا چاہیئے۔"

"کیا لے کر جانا چاہتے ہیں آپ؟"

"کوئی ایسی بات جسے میں نبھا سکوں۔"

"صوم وصلوٰۃ؟"

"نہیں یہ بات مجھ سے نبھے گی نہیں"۔

خدا کہتا ہے کہ تم پر نماز روزہ فرض کر دیا گیا ہے۔ اس سے روگردانی کرنے والے کو بخشوں گا نہیں اور یہ ہیں کہ خدا کے گھر میں بیٹھ کے کہہ رہے ہیں نماز روزہ مجھ سے نبھے گا نہیں۔ خُدا کے سامنے تو بڑے بڑے باجبروت انسانوں نے بھی گھٹنے ٹیک دیے۔ گھگی بندھ گئی مگر یہ خُدا کے گھر میں بھی بیٹھ کے کہہ رہے ہیں۔ اے اللہ! میں تیرے حکم کی بھی تعمیل نہ کر سکوں گا۔ سچ بولنے کی اس سے خطرناک مثال اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ نفسیات کی اُلٹی سیدھی گتھیوں پر بلا جھجک لکھنے والے فرائیڈ کے ہمنوا پر، میں یہ مذہب و ذہب کا کیا چکر چلا رہا ہوں یا یہ کہ ایسا شخص خدا کے گھر کیسے پہنچ گیا۔ آپ کی سوچیں برحق، اس ضمن میں میری درخواست صرف اتنی ہے کہ سابقہ ممتاز مفتی اور موجودہ الحاج ممتاز مفتی کو دو الگ الگ شخصیتیں جانیں۔ سابقہ مفتی تو یوں سوچتے تھے :۔

"کالج کے زمانے میں مغربی مشاہیر سے متعارف ہوا۔ وہ سب میرے اردگرد آ بیٹھے۔ مجھے سمجھانے لگے، برٹنڈرسل بولا۔ میاں شک کرو۔ ہر بات پر شک، ہر بات کو جانچو، پرکھو، سکیپٹیسزم بہت عمدہ شے ہے۔ شک کرو۔ سکیپٹک بنو، دانشور کہلاؤ۔

ڈارون بولا۔ بھائی عقل کے ناخن لو۔ کیا سات دن میں یہ وسیع و عریض کائنات تعمیر کی جا سکتی ہے؟ نہ بھائی یہ جادو کا کھیل نہیں۔ ہاتھ کی صفائی نہیں۔ شعبدہ بازی نہیں۔ یہ تخلیق کا کارنامہ ہے۔ ارتقا کا مسئلہ ہے۔ صدیوں کا ارتقا!

جینز بولا۔ کیا کہا؟ سات آسمان؟ کیا مطلب جناب والا؟ آسمان تو وجود ہی نہیں رکھتا۔

یہ نیلا نیلا جو دکھائی دیتا ہے یہ تو خلا ہے۔ ہوا نے روشنی کی نیلی نیلی لہریں جذب کر لی ہیں۔ یہ تم سات آسمانوں کے چکّر میں کیسے پڑ گئے۔ یہاں تو کروڑوں سورج ہیں۔ اربوں زمینیں ہیں۔ لاکھوں سسٹم ہیں۔ نہ جانے کتنی کائناتیں ہیں۔ اپنے تخیل کو وسعت دو۔ سات آسمانوں پر محدود نہ کرو۔

پھر فلسفی آگے بڑھے۔ ایک بولا۔ یہ جو جو کچھ تمہیں دکھتا ہے کیا ایسا ہی ہے جیسے کہ ہے؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ دوسرا بولا۔ اونہوں ہم تو حواسِ خمسہ کے اسیر ہیں۔ تمہیں کیا پتہ، کیا ہے کیا نہیں ہے؟ تیسرا بولا۔ چاہے وہ وجود رکھتے ہیں یا نہیں، پر اللہ میاں ہیں کار آمد شے، اگر وہ نہ بھی ہوتے تو بھی ہم انہیں تخلیق کر لیتے۔ چوتھا ہنسنے لگا۔ بولا، جہنم کے ڈر کے مارے کی ہوئی نیکی کو نیکی کہتا ہے تُو؟ احمق وہ تو مجبوری ہوئی۔ نیکی وہ ہے جو اپنے دل سے پھُوٹے، بے مقصد، بے لاگ، ذرا سوچو، پانچواں بولا۔ اونہوں سوچو نہیں، سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ سوچ بچار کی ناؤ صرف ڈبکنیاں کھاتا جاتی ہے، پار لگاتا نہیں۔ پار لگنا ہے تو آنکھیں موند لو۔ ظاہر کی آنکھیں بند ہو جائیں تو باطن کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں۔ چھٹا چلّایا، بکتا ہے۔ اس کی بات پر کان نہ دھرو آنکھیں موندھو نہیں کھولو۔ دیکھو اور دیکھتے جاؤ۔ دیکھو تو تمہارے اِرد گرد کتنے معجزے بکھر پڑے ہیں۔ کتنے معجزے!"

یہ سوچیں اُس شخص کی ہیں جو ممتاز مفتی کے نام سے بدنام ہیں جنہوں نے بہت سے ذہنوں کو ورغلایا، جن کی باتیں سُن کے ذہن سُن ہو جاتے ہیں۔ بظاہر حمق سے خالی عقل سے بھری ہوئی سوچیں اور پھر یہ سوچیں اُس شخص کی ہیں جن کے آبا و اجداد مغلوں

کے دَور میں میر منشی تھے اور جنہیں متقی کا لقب عطا ہوا تھا۔ بات یہاں تک بھی کہاں ختم ہوئی ہے جو اطمینان کا سانس لیں۔ پھر سُنیئے :۔

"اب میرے الحاد کی نوعیت ایسی تھی جیسے سمندر پر برف کا تختہ جما ہو جس کے تلے پانی ہی پانی ہو۔ الحاد کا یہ تختہ بہت ہی پتلا تھا جو اکثر ٹوٹ جاتا اور میں ایمان کے پانیوں میں ڈبکیاں کھانے لگتا۔ پھر رینگتا پھسلتا، گرتا پڑتا، بصد مشکل برف کے تختے پر چڑھ جاتا۔ میرے ذہن میں پشتوں کا ایمان جھلک رہا تھا۔ ذہن گویا الحاد کی ایک ناؤ تھی جو ایمان کے پانیوں میں ڈول رہی تھی"

پھر بچپن کا رونا لے بیٹھے :۔

"امی قدم قدم پر کہتیں، اُونہوں ایسا نہیں کرتے۔ اللہ میاں ناراض ہو جاتے ہیں۔ دادی اماں کہتیں، نہ بیٹا ایسا کرو گے تو اللہ میاں غصے ہوں گے۔ وہ دونوں بات بات پر اللہ میاں کی دھونس دیا کرتی تھیں اور میں ان کی دھونس کو مانتا تھا۔ جُوں جُوں عمر بڑھتی گئی۔ یہ بات واضح ہوتی چلی گئی کہ بچاؤ کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ بڑے بوڑھوں کی باتوں پر کان ہی نہ دھرا جائے۔ سب سُنی اَن سُنی کر دی جائیں۔ غرض مغربی مصنفین کی تحریروں سے میرے ذہن میں اسلام اور جنس یوں گڈمڈ ہو گئے۔ جیسے آسمان اور نیلگوں جھال، جب بھی اسلام یا حضور اعلےٰ صلعم کے متعلق سوچتا تو میرے ذہن میں جنس کی عُریاں تصویریں اُبھرتیں اور آنکھوں کے سامنے یوں متحرک ہو جاتیں جیسے کوئی بلیو فلم چل رہی ہو اور میرے نزدیک محمدؐ کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا حرم تھا جس میں کئی ایک بیویاں اور لونڈیاں تھیں۔

پھر تجسّس کا دَور آیا" راستہ تلاش کرو" کا یہ دَور مسلسل آوارہ گردی میں گزرا، حتیٰ کہ آوارہ گردی کی خُو پڑ گئی۔ آوارہ گردی میں لذّت ملنے لگی اور نتیجہ یہ ہوا کہ آوارہ گردی منزل بن گئی۔ ایسے میں قدرت اللہ شہاب سے ملاقات ہوئی۔ شہاب سے ملنے سے پہلے میں بڑے مزے میں تھا۔ میں جس سمت دیکھ رہا تھا۔ اُس میں میرے لیے بڑی دلکشی تھی مگر اُس سمت سے، اس نے کچھ اس طرح سے میرا رُخ موڑا کہ مجھے کچھ بھی پتہ نہ چلا اور میری دنیا بدل گئی۔ اب ہر سڑک روم کو جاتی ہے کے مصداق میرے لیے ہر چیز اللہ نما ہو گئی۔ گرد و پیش میں سب کچھ دھندلا گیا۔ صرف اللہ! یہاں وہاں، اِدھر اُدھر ہر طرف اللہ!"

بُرائیاں ڈھونڈنے والوں کو مفتی میں بہت سی بُرائیاں بھی مل جائیں گی مگر اُنہیں بھی ریاکاری نہ ملے گی۔ بُرائی خالص بُرائی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جتنے دوست ہیں۔ اس سے زیادہ دشمن ہیں۔ اس لیے کہ دنیا داری میں بالکل کورے ہیں۔ ملمّع بازی کے فن سے بھی ناآشنا، کچھ ایسے دھوکا ہو رہا ہے جیسے یہ کلمۂ حق کہنے والوں کے رشتہ دار ہوں۔ ان کے سچّے پن سے میں بھی بڑا عاجز ہوں۔ مثال کے طور پر میں ان سے کہتا ہوں "مفتی جی اب کے افسانہ ضرور لکھ دینا"

جواب! "مشکل ہے"

پھر مَیں کہتا " اتنے اچھے آدمی کے منہ سے ایسے بے رُخی والے جملے اچھے نہیں لگتے"

جواب! "میں قطعاً اچھا آدمی نہیں، بہت بڑا فراڈ ہوں" (وہی متضاد روی والی بات)

میں مفتی جی سے دُور رہا۔ یہ ایک جگہ ٹکے نہیں۔ میں ایک جگہ سے ہلا نہیں۔ اِس لیے مجھے ان کے فراڈ پن کا علم نہ ہو سکا۔ میں ہمہ وقت عالمِ تجسّس میں رہتا ہوں۔ اِس کے باوجود میں ان کی کسی بُرائی کو پکڑ نہ سکا۔ حاضری کا مسئلہ ہو یا عدم حاضری کا، میں نے ان میں بے اندازہ خلوص پایا۔ ایسا خلوص جو چونکا دے مثلاً آپ اپنی کسی مصروفیت کی بنا پر، یا کسی پریشانی کی وجہ سے خط نہ لکھ سکیں گے یا لکھیں گے تو مختصر سا، تو اِن کا خط آئے گا۔ "تیرے موجودہ روّیہ سے غیریّت کی بُو آنے لگی ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔" شکایت میں بھی اپنایت، تکلّف سے مبرّا اپنایت!

خط نویسی کے سلسلے میں، مولانا محمّد علی جوہر کا ایک لطیفہ یاد آگیا ہے۔ مولانا نے اپنے کسی عزیز کو پچاس صفحوں کا ایک خط لکھا تھا اور اس پر معذرت چاہی تھی کہ "آجکل بہت مصروف ہوں۔ اس لیے اتنا لمبا خط لکھا ہے۔ فرصت ملتے ہی مختصر خط لکھونگا۔"

کم سے کم لفظوں میں اپنا مدّعا بیان کرنا، بہت بڑا آرٹ ہے۔ منٹو بھی اس خبط میں مبتلا تھے۔ انہوں نے ایک مشہور افسانہ نویس کو لکھا تھا۔ "آپ نے کئی سطور، اس چھوٹی سی چیز کی نذر کر دیں۔ حالانکہ چند لفظوں میں آپ اپنا مطلب واضح کر سکتے تھے۔" اس کلیے کو سامنے رکھتا ہوں تو "علی پور کا ایلی" بہت کھلتی ہے۔ ممکن ہے مفتی نے بھی فرصت کم ہونے کی وجہ سے اتنا طویل ناول لکھ دیا ہو۔ انہیں بھی کبھی فرصت ملی تو مختصر ناول لکھیں مگر یہ ناول تو نہیں یہ تو اُن کی اپنی سوانح معلوم ہوتی ہے۔ جو طوفان ان کے سینے میں مقیّد ہے۔ اُس کی موجودگی میں تو یہ کتاب بہت مختصر ہے۔ کم سے کم لفظوں میں، بھلا یہ اور کس طرح بات کریں۔ مثلاً "والد خوش گفتار تھے۔ رنگیلے تھے۔ اس لیے

میرے تخیل کے ہیرو تھے۔ نئی امّی ہیروئن تھی[1]۔" اب آپ بتلائیے اس ایک لائن میں کتنے صفحوں کا مواد نہیں ہے؟ زیادہ کیا عرض کروں۔" علی پور کا ایلی" پر چند سطریں بہت پہلے میں نے بھی لکھی تھیں۔ وہ پھر سُن لیجئے:۔

۱۹۶۱ء میں سُنا کہ رائٹرز گلڈ کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچی ہے جسے دو مزدوروں نے اٹھا کر دفتر تک پہنچایا۔ یا اللہ وہ کتاب کون سی ہوگی۔ کس کی ہوگی؟

معلوم ہوا کتاب کا نام" علی پور کا ایلی" ہے اور مصنّف ممتاز مفتی ہیں۔ پھر یہ چرچا بھی سُنا۔ اب اس کتاب کو انعام ملے گا کیوں کہ یہ اس مفتی کی لکھی ہوئی ہے جو شہاب کا دوست ہے

اُن دنوں میں مفتی سے زیادہ شہاب کو جانتا تھا۔ سوچا محض دوستی کتاب کو انعام نہ دلوا سکے گی۔ کیوں کہ یہ ضروری تھا کہ اُمیدوار ادب شناس سے زیادہ مردم شناس ہو۔

میں مفتی سے کم مگر اس کے فن سے زیادہ واقف تھا۔ اس لیے مطمئن ہوگیا کہ یہ کتاب تو انعام کی زد سے صاف بچ جائے گی۔ چنانچہ وہی ہوا۔ اعلان ہوگیا۔ مفتی کی کتاب ہار گئی۔

آخر لکیر کے فقیر اس کتاب کا لوہا مانتے بھی کیسے؟ مفتی تو اجتہاد کے راستے پر چل نکلا تھا۔ بے اختیار منہ سے نکلا۔ الٰہی خیر! —— ایک کہانی میں اتنی کہانیاں کہ سر نہ اُٹھانے دیں۔ پھر ناول نویسی میں اجتہاد، سوانح نگاری میں اجتہاد، جو جھنجھوڑنے سے لے کر موہ لینے تک کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اس کتاب کی تو سطر سطر بولتی ہے۔ اِسے کون چپ کرائے گا؟ کیا نقادانِ ادب؟

---

[1] یہ عبارت" علی پور کا ایلی" میں سے نہیں ہے۔ یہاں ان کا ضبطِ تحریر میں لانا دوگونہ مقاصد سے ہے۔ ایک حالات سے باخبری کے ماتحت، دوسرے الفاظ کی کفایت شعاری کے تحت!

کیا" یارانِ وفا"؟

کوئی نہیں!

کتاب تو مستقبل کے سینے پر نقش ہو گئی۔

مفتی اللہ والے ہیں یا توہم پرست، اس کے بارے میں کچھ سوچنا یا لکھنا، خطرے سے خالی نہیں۔ اللہ والے نکلے تو اللہ میاں خبر لیں گے۔ توہم پرست نکلے تو مفتی جان کے لاگو ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ یہ تو اپنے آپ کو کسی وہم میں مبتلا نہیں سمجھتے۔ یہ تو اپنی حد تک سرشارِ تمنا ہی نظر آتے ہیں۔ رونا ہے تو اپنی نگاہِ عجز کا، نامہ خراب ہو گا تو ہم گنہگاروں کا، بہر حال سنیئے تو یہ کیا کہتے ہیں؟:-

میرے تجربات اور مشاہدات گذشتہ دس برسوں میں ایک ایسے راستے پر چل نکلے ہیں جو عقل و خرد سے ہٹ کر ہیں اور دانشوروں کے لیے جاذبِ نظر نہیں اور ابھی تک میں کوئی ایسا زاویۂ نظر حاصل نہیں کر سکا جس کی مدد سے EXTRASENSORY - PERCEPTIONS سے متعلقہ مشاہدات ایسے انداز میں پیش کر سکوں کہ وہ دانشوروں کے لیے ناقابلِ قبول نہ ہوں۔ ایسا زاویہ تحریر جس میں تاثر ہو جو قاری کو کم از کم میرے خلوص کا یقین دلا سکے۔

اب وہ ناقابلِ قبول مشاہدات کیا ہیں اور کیسے ہیں؟ وہ بھی دیکھ اور پڑھ لیجئے۔ خود شناسی ہے یہ یا خود نگر ہی؟ میں کچھ نہیں کہتا۔ بتانِ شوخ کا معاملہ ہوتا تو کچھ کہتا بھی، یہ تو بندہ پہ خُدا کی چشمِ عنایت والا معاملہ ہے یا عقدہ ہائے کار کا، اس کے بارے میں سوچنا، میرے فہمِ تصوّر کے بس کا روگ نہیں۔ بہر حال مفتی کی باتیں تو سنیں:-

"ایک روز میں قبرستان کی طرف جا نکلا۔ دیکھا کہ ایک معمولی سی چار دیواری کے اندر خواجہ صاحب ایک مزار پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ میں رُک گیا۔ فارغ ہونے کے بعد خواجہ صاحب حسبِ دستور بڑے تپاک سے ملے۔ کہنے لگے کیا حال چال ہے ؟ میں نے کہا کوئی خاص اچھا نہیں۔ بس غم کھا رہے ہیں۔ بولے کیوں ؟ غم کس بات کا ؟ میں نے کہا۔ خواجہ صاحب پاکستان کا کیا بنے گا ؟ یہ کشتی تو ڈول رہی ہے۔ میں نے یہ بات یونہی کہہ دی تھی۔ خواجہ صاحب میری بات سُن کر دفعتاً سنجیدہ ہو گئے۔ مفتی صاحب! وہ بولے، پاکستان کا غم آپ کیوں کھاتے ہیں۔ جب کہ پاکستان کا غم کھانے کے لیے بڑی بڑی ہستیاں موجود ہیں۔ اس لیے آپ کو یا مجھے غم کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ساعت کے لیے وہ رُک گئے۔ پھر بولے، اُس بڈھے کو دیکھتے ہیں آپ ؟ میں نے اُس کی جانب دیکھا جدھر خواجہ صاحب اشارہ کر رہے تھے۔ جس پر وہ ابھی فاتحہ پڑھ کے آئے تھے۔ خواجہ صاحب بولے، اس بڈھے نے اپنی تمام تر زندگی قیامِ پاکستان کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہ بُوٹا اس بڈھے کا لگایا ہوا ہے۔"

ہم تو اب تک یہ سُنتے آئے تھے کہ پاکستان قائدِ اعظم کے تدبر اور مسلمانوں کے یقینِ محکم نے بنایا تھا مگر یہ بندۂ خدا کہتا ہے اس بڈھے نے بنایا تھا جو تہِ خاک سو رہا ہے۔ جہدِ جنوں سُنا کچھ تھا۔ بقول ان کے نکلا کچھ، یہ رنجِ آگاہی کا مقام ہے یا نشاطِ تعبیر کا ؟ اس مسئلے کو ابھی نہیں چھیڑتا، بات آگے چلاتا ہوں :۔

صاحب نے کہا۔ آپ دروازہ پر سیکورٹی کے کمرے میں چلے جائیں۔ وہاں ایک شخص مجھ سے ملنے کے لیے مُصر ہے۔ آپ اس سے جا کر بات کریں اور دیکھئے صاحب

بولا۔ سیکورٹی کے کمرے میں بات نہ کریں۔ اسے باہر لے جائیں، علیحدگی میں، سمجھے!

سیکورٹی کے کمرے میں ایک دہقان قسم کا آدمی کھڑا تھا۔ میں اسے باہر باغیچے میں لے گیا۔ کہا، صاحب کام میں مصروف ہیں۔ انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔ اگر آپ یہ بتا دیں کہ آپ انہیں کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں تو ۔۔۔ میں ابھی جملہ ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ بولا۔ بابوجی میں نے صاحب سے مل کر کیا لینا ہے۔ مجھے تو اس سے کوئی کام نہیں۔ نہ ہی میں اسے جانتا ہوں۔ میں اپنے گاؤں سے آرہا تھا۔ اس سڑک کے پاس مجھے ایک سانڈھنی سوار ملا۔ اُس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں پاس گیا تو وہ کہنے لگا میاں اس مکان کے اندر جاؤ۔ صاحب سے ملو اور ہمارا ایک پیغام اسے دے دو۔ سانڈھنی سوار ایک بزرگ آدمی تھا۔ میں نے اس کی بات مان لی اور اِدھر آگیا۔ لیکن یہ پولیس والے دوسرے کی بات ہی نہیں سُنتے۔ میں نے کہا۔ آپ پیغام مجھے دے دیں میں صاحب تک پہنچا دوں گا۔ سانڈھنی سوار نے مجھ سے کہا۔ وہ بولا۔ جا کر اسے کہہ دو کہ جو کاغذ وہ لکھ رہا ہے وہ غلط ہے اور جو وہ لکھ کر پھاڑ چکا ہے وہ صحیح تھا۔

جب میں نے یہ بات صاحب کو بتائی تو اُس نے مجھے ردّی کی ٹوکری سے کاغذ کے پُرزے اکٹھے کرنے کے لیے کہا۔ لکھا ہوا خط پھاڑ دیا۔ پھٹے ہوئے خط کو جوڑ لیا۔ میں نے سوچا، شاید اللہ میاں کسی ملک یا فرد میں خصوصی دلچسپی لینے سے گریز نہ کرتے ہوں۔ آخر وہ مالکِ ارض و سما ہیں۔ اگر وہ کسی سے کوئی بات کرنا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔

ہم نے آج تک تو یہی سُنا تھا کہ خُدا نے یا تو موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کیں یا

وحی کے ذریعہ، رسول اللہؐ سے، اب مفتی صاحب کہتے ہیں کہ خدا نے ایک سانڈھنی سوار کے روپ میں، میرے صاحب سے باتیں کیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مفتی پاگل ہیں یا ہمیں پاگل بنا کے چھوڑیں گے۔ سچ مجھے تو اب ان سے خوف آنے لگا ہے۔ امرِ نادیدہ کی جستجو تو ہے مگر عرضِ جنوں کروں تو کس سے کروں؟ دلِ رنجیدہ اور رنجیدہ ہو گیا۔

ابھی مفتی صاحب کا چپ ہونے کا ارادہ نہیں، کہے جا رہے ہیں۔ وہ بھی پورے جذب اور کامل والہانہ پن کے ساتھ! یا اللہ میں کیا کروں؟ —— "صاحب اور میں دَورے پر کراچی گئے ہوئے تھے۔ ایک شام ہم سینٹرل جیل گئے۔ صاحب کو وہاں کچھ کام تھا۔ ابھی وہ کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ جیل کے ایک گارڈ نے آکر سلوٹ مارا، بولا، حضور ایک قیدی آپ کا نام لے کر پکار رہا ہے۔ کہتا ہے اسے بلاؤ۔

ہم اس گارڈ کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ایک چھوٹے سلاخ دار کمرے میں ایک ہیجڑا بند تھا۔ صاحب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ تالا کھلا تو وہ اندر داخل ہو گیا اور گارڈ سے کہنے لگا۔ تم جاؤ۔ گارڈ چلا گیا۔ میں اوٹ میں کھڑا رہا۔

ہیجڑے نے صاحب کو دیکھتے ہی چلّا کر غصّے سے کہا۔ "تجھے خبردار کرنے کے لیے ہمیں قید ہونا پڑا"۔

یہ سنتے ہی مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور میں وہاں سے بھاگا۔ یا اللہ یہ کیا اسرار ہے؟ اگلے روز میں اکیلا جیل پہنچا لیکن وہ قیدی وہاں نہیں تھا۔ معلوم ہوا، وہ کل ہی سے غائب ہے۔

دیکھ لیجئے، مفتی اب ایسی باتیں سوچتے اور لکھتے ہیں اور اس پر کہتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے مشاہدات کو ایسے انداز میں پیش کر سکوں جو دانشوروں کے لیے بھی قابلِ قبول ہوں۔ کہاں وہ مفتی، جو کہتے تھے شک کرو۔ ہر بات میں شک کرو۔ کہاں یہ مفتی جو کہتے ہیں۔ سچ جانو، ہر بات کو سچ جانو، ایک سلسلہ در سلسلہ زنجیرِ رسوائی وہ بھی ایک سکون آمیز التماسِ لذّت یہ ہے۔ اصل میں مزا تو اس وقت آئے گا۔ جب" علی پور کا ایلی" کا دوسرا حصّہ" ایلی اور الکھ نگری" چھپے گا۔ اُس وقت یا تو ہم پتھر لے کر مفتی کے پیچھے ہوں گے یا مفتی ہمارے پیچھے پیچھے ہوں گے اور ہم سب ایک دوسرے کو دیوانہ کہہ رہے ہوں گے اور ذہنوں سے پردہ صرف اُس وقت اُٹھے گا جب سیرِ عدم کے لیے یاد کیا جائے گا۔

میں سُنتا چلا آیا ہوں کہ اچھا لکھنے کے لیے، بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ہی چیز کو جب تک متعدد بار لکھا نہ جائے اس کی نوک پلک درست نہیں ہوتی اور یوں نوک پلک درست کرتے کرتے بہتوں نے اپنی صحت کی نوک پلک خراب کر ڈالی مگر لکھنا پھر بھی نہ آیا۔ مفتی اس کے برعکس کہتے ہیں۔ سنیئے :۔

" میں اُن لکھنے والوں میں سے ہوں۔ جنہیں شہرت پہلے ہی سے پیشگی طور پر مل گئی اور بعد میں افسانہ نویسی سیکھنی پڑی۔ عام طور سے ہونا یوں ہے کہ لوگ پہلے لکھتے ہیں۔ بار بار لکھتے ہیں۔ بار بار چھپتے ہیں۔ پھر کہیں شہرت حاصل ہوتی ہے اور یہ بھی لازم نہیں کہ ضرور شہرت حاصل ہو جائے۔"

میں نے پوچھ لیا" جناب کے نزدیک، ادیب میں کیا کیا خصوصیات ہونی چاہئیں؟"

" صرف ایک!"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ اس کی تحریریں، اس کی اپنی چھاپ ہو۔ یعنی اس میں انفرادیت ہو۔ اگر کسی کی تحریر میں نُدرت نہیں۔ الگ پن نہیں تو میں اسے ادیب ماننے کے لیے تیار نہیں۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا لکھاڑ کیوں نہ ہو میرے نزدیک ایک منشی اور ایک ادیب میں صرف یہی فرق ہے۔"

پھر ایک اور موقع پر کہا:۔

"علم ہر فن کے لیے ضروری سمجھا گیا ہے۔ مگر میں علم کو سب کچھ نہیں سمجھتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ بڑے بڑے عالم تخلیقی کام میں صفر نکلتے ہیں اور ایک تھوڑا پڑھا لکھا تخلیق کار ہوتا ہے۔ ادب میں ایسی مثالیں متعدد ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً کا جواب یہ ہے کہ تو بھی سب کچھ جانتا ہے۔ پھر مجھے کیوں سچ نما غیبت پر مجبور کر رہا ہے۔"

"بہت اچھا صاحب!" — پھر توقف کے بعد یوں جواب دیا "میں تو ادیبوں کو پھول سے تشبیہ دیتا ہوں۔ بعض ادیب بے شمار کتابیں لکھتے ہیں مگر وہ ادب میں اپنا کوئی مستقل مقام نہیں بنا سکتے۔ ایسے ادیبوں کو میں سورج مکھی کا پھول سمجھتا ہوں۔ بہت بڑا مگر خوشبو سے خالی، بعض ادیب تھوڑا لکھتے ہیں مگر ادب میں ان کی جگہ ناگزیر ہوتی ہے۔ ایسے ادیبوں کو میں چنبیلی کا پھول کہتا ہوں۔ چھوٹا مگر خوشبودار!"

جہاں تک مفتی کا یہ کہنا ہے کہ مجھے شہرت (کچھ سعی کیے بغیر) بہ طورِ پیشگی مل گئی

تھی۔ میں اسے نہیں مانتا اور شعبوں میں تو یہ چکر ممکن ہے لیکن ادب کے میدان میں یہ بھی ممکن نہیں۔ یہاں تو نوکِ قلم سے خون ہی ٹپکنے والا معاملہ ہے۔ اس راہ میں جسے بھی کچھ ملا۔ اُسے خونِ جگر کے صدقے ہی میں ملا۔

ادب میں گروہ بندی کی بات چلی تو انھوں نے کہا "بعض ادیب اپنے آپ کو بُت کے طور پر منوانا چاہتے ہیں اور منوا لیتے ہیں۔ وہ بات کو ہمیشہ بہت اُونچی سطح سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے کوئی بڑی شے ہوں۔ پھر شہر وار حلقے بناتے ہیں۔ ہدایات جاری کرتے ہیں مثلاً فلاں شخص نے میرے خلاف مضمون لکھا ہے۔ تم بھی لکھو۔ فلاں سے غزل لے کر بھیج دو تاکہ اسے اپنے رسالے میں چھاپ کر، آئندہ کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ لوگ ادیب نہ ہوں کسی ٹریڈ یونین کے عہدہ دار ہوں۔ یوں وہ اندھوں میں کانا راجہ بن جاتے ہیں۔ بن جائیں مگر میری طبیعت کا عالم یہ ہے کہ میں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کسی کے لیے کبھی بھی بُت نہ بن سکوں گا۔ میرے لیے تو یہی سعی بہت ہے کہ کسی بُت کا پجاری بننے سے بچ سکوں۔ میرا تجزیہ یہ ہے کہ جیسے موجودہ ادیبوں کو اپنے اُوپر اعتماد نہ ہو اور وہ حلقے اور گروہ بنا کر ہی زندہ رہ سکتے ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ یہ وبا آج کی تو نہیں۔ ابتدا سے چلی آ رہی ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ ہماری رنجشیں اور دوستیاں کسی اصول کی بناء پر استوار ہوتیں۔ کہنی مار کے آگے بڑھنے کو میں نے ہمیشہ چھوٹی بات جانا۔

چونکہ مفتی دوست ہیں اس لیے انہیں میری تحریریں بھی عزیز ہیں۔ انھوں نے

مجھ سے کہا۔" میں تیری تحریر کا دلدادہ ہوں"۔

"مجھے تو اپنا لکھا پسند نہیں"۔

"بات یہ ہے کہ ادیب کے دل پر آری چلتی رہتی ہے۔ جب آری کی کاٹ کا رُخ چڑھاؤ کی طرف ہوتا ہے تو ادیب سمجھتا ہے میں بہت کچھ ہوں۔ جب کاٹ کا رُخ اتراؤ کی طرف ہوتا ہے تو وہ سمجھتا ہے مَیں کچھ نہیں ہوں۔ یہی حال میرا ہے۔ یہی حال تیرا ہے یہی حال سب کا ہے"۔

چونکہ "یہ حال" مفتی کا بھی ہے۔ اس لیے میں نے مفتی کی اس سوچ کو بھی قید کر لیا۔ گھات میں جو بیٹھا ہوں۔ اس لیے بکھری ہوئی شخصیت کے ٹکڑوں کو اِدھر اُدھر سے سمیٹنے میں لگا ہوں۔

ادبی میدان میں، مفتی افسانہ نگار کی حیثیت سے ممتاز ہیں مگر ترنگ میں آکر انہوں نے ایک کتاب شخصیتوں کے احوال کے ضمن میں بھی لکھ ڈالی (واقعہ یہ ہے کہ خوب لکھی)

میں نے چھیڑا۔" آپ نے شخصیات پر کتاب لکھ کر اچھا نہیں کیا"۔

"کیوں؟"

"آپ نے میرے میدان میں قدم رکھ دیا"۔

"میرا اور تیرا میدان مختلف ہے۔ کیوں کہ میں شخصیت میں سے صرف ایک پہلو کی وضاحت کرتا ہوں۔ صرف ایک نکتے کی وضاحت!"

اس ضمن میں یہ وضاحت ایسے کر رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔ نہیں نہیں طفیل، میرا اڈا کھڈا لنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ کہتا۔ یوں لکھے جاتے

ہیں مضامین۔ اچھی بات یہ ہے کہ انکساری نے بھی ممتاز مفتی کی ریڑھ مار دی ہے۔

مفتی کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کہیں گے کہ مفتی صاحب آپ نے تشریف لاکر مجھ پر بڑا کرم کیا تو یہ جواب میں کہیں گے۔ کرم ورم کچھ نہیں کیا۔ میں اِدھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا ذرا آپ کو بھی جھانک لوں۔ حالانکہ واقعہ اس کے برعکس ہوگا اپنے دو چار کام چھوڑ کر ہی اِدھر آئے ہوں گے۔

اگر آپ ان کے کسی افسانے کی تعریف کریں گے تو جواب یہ ہوگا۔ یار کوئی اور بات کرو۔ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہو۔ اس لیے کہ ابھی تک تو مجھے لکھنا ہی نہیں آیا۔ دو چار اکھر لکھ لینے کا مطلب یہ نہیں کہ میں کوئی بڑا فن کار ہوں۔ پھر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مجھے اُردو لکھنا نہیں آتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے افسانہ لکھنا آتا ہے۔ حالانکہ مجھے نہ اُردو لکھنا آتی ہے اور نہ افسانہ لکھنا آتا ہے۔ ہاہاہا!

اگر آپ ان سے یہ کہہ دیں کہ مفتی صاحب! میں آپ کے خلوص سے بڑا متاثر ہوں تو یہ جھٹ کہیں گے۔ خلوص نام کی چیز مجھ میں قطعاً نہیں۔ بڑا بے مروّت انسان ہوں اور اگر کوئی بے تکلف دوست یہ کہہ دے "مفتی تُو بڑا بیہودہ ہے" تو یہ جواب میں کہیں گے تیری جھُوٹ بولنے کی عادت ختم نہیں ہوئی۔ مطلب یہ کہ جہاں تک ان کی ذات کا مسئلہ ہے۔ انہوں نے آپ کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی (وہی تضاد روی) اس کے باوجود اس مَیں نہ مانوں میں بھی ایک طرح کا حُسن ہوتا ہے اور وہ حسن یہ ہے کہ لہجہ دل آزارانہ نہ ہوگا بلکہ حد درجہ اپنایت نما ہوگا۔ یعنی مفتی کی اختلافی گفتگو پر جھنجھلاہٹ نہیں برستی بلکہ خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ غصّہ نہیں آتا پیار آتا ہے۔ فنِ گفتگو میں اسے تکلّم کا طلسم نہیں کہیں گے تو

اور کیا کہیں گے؟ اب ایک راز کی بات بھی سُن لیں۔ ان کے جس کے ساتھ جتنے زیادہ تعلقات ہوں گے اُسے یہ اُتنے ہی پیار سے خطاب کریں گے۔ یعنی حاصلِ گفتگو ابے تبے سے لے کر، بے ایمان، اُلّو کے پٹھّے، حرامزادے تک ہے۔ ویسے ایسے خوش بخت کم ہوں گے جنہیں تعلقات کا آخری درجہ ملے۔ یہ خود کہتے ہیں کہ میں نے زندگی میں صرف پانچ چھ آدمیوں کو اپنا دوست سمجھا ہے۔ وہ جیسے بھی ہیں۔ مجھے بے حد عزیز ہیں۔ مجھے اُن کی حرامزدگیوں سے کوئی غرض نہیں۔ بُرے ہیں تو ہوا کریں۔ بس مجھے تو وہ اپنی ہر حیثیت میں عزیز ہیں۔ اور یہ بھی، میں تو متکلّم ٹائپ کا آدمی ہوں۔ جہاں بیٹھوں گا بولنا شروع کر دوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ میرے دل میں ہوتا ہے اُسے جہاں تہاں بکھیر دیتا ہوں۔ میں اگر کسی کو اچھا نہیں سمجھتا تو اس کا بھی اظہار کر دوں گا۔ اگر میں کسی کو پسند کرتا ہوں تو چھاتی پر (سینہ پر) ہاتھ مار کے اس کا بھی اظہار کر دوں گا۔ غرض میری گفتار کو مصلحت آمیزی سے کوئی واسطہ نہیں۔

میں نے ایک مرتبہ، ان کا تعارف اپنے ایک دوست سے کرایا کہ یہ اُردو کے بہت بڑے افسانہ نگار ممتاز مفتی ہیں۔ جن کے افسانے فنّی اعتبار سے بہت بلند ہوتے ہیں انہیں معلوم تھا کہ میرا جن سے تعارف کرایا جا رہا ہے وہ اگر یو پی کے نہیں تو دِلّی کے ضرور ہیں۔ چنانچہ میری بات کے جواب میں کہا " چھڈ یار کدی تے کم دی گل کیتا کر" (یہ عموماً پنجابی میں بات کرنا پسند کرتے ہیں) اب میرے دوست میری طرف دیکھ رہے ہیں کہ میں انہیں مفتی کی بات کا ترجمہ کر کے سناؤں۔ چنانچہ میں نے اپنی بات رکھنے کے لیے کہا " کہہ رہے ہیں۔ اگر میری کوششیں اُردو ادب کے لیے قابلِ توجہ ہیں تو میں بھی خوش ہوں۔ ابھی

میری بات ختم بھی ہونے نہیں پائی تھی کہ بیچ میں بول پڑے۔ بطفیل جو کچھ کہہ رہا ہے غلط کہہ رہا ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے تو لکھنا آتا ہی نہیں۔ پھر اپنی رائے کا اظہار کریں گے میرے ہمعصروں میں تو افسانہ نگار ایک ہی ہے اور وہ ہے راجندر سنگھ بیدی، اس کے علاوہ میں کسی کو نہیں مانتا۔

مخاطب بھی ہاں میں ہاں ملائے گا "جی ہاں وہ خوب لکھتے ہیں"۔

جناب وہ خوب ہی نہیں لکھتے۔ وہ تو اُردو افسانہ کا خُدا ہے خُدا، جس نے مجھ جیسے کئی افسانہ نگاروں کو لکھنا سکھا دیا۔ اوروں کا فن دن بہ دن تنزل پذیر ہوتا ہے۔ اس کا فن دن بدن اوج پر ہے۔ آسمانوں کو چھُو رہا ہے۔ اب تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ اپنے فن کی گرہوں کو کھول رہا ہو۔

وطن سے محبت سب کو ہوتی ہے مگر انہیں غایت درجہ ہے۔ بلکہ انہوں نے ایک مضمون پاکستان کو عنوان بنا کر لکھا ہے۔ خود کہتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس موضوع پر کیوں لکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ آج تک میں نے اس موضوع پر کیوں نہیں لکھا۔

ہمارے ہاں جب آئے دن وزارتیں اور صدارتیں بدلنے لگیں تو یہ اُن دنوں تقریباً حواس باختہ تھے۔ تلملاتے تھے مگر ان کے بس میں کچھ نہ تھا۔ پریشان ہو سکتے تھے۔ سو تھے۔ پھر جب ہماری کرتوتوں کی وجہ سے مارشل لا لگ گیا اور ایوب خاں صدر بن بیٹھے تو یہ بہت کڑھے۔ اسے اپنی بدقسمتی کی علامت سمجھا۔ مگر جب ابتداء میں ایوب خان نے اچھے کام کیے تو یہ ان کے مداحین میں تھے اور پیش پیش تھے۔ پھر جب ایوب خان کی لوٹ کھسوٹ

اور بے تدبیریوں کے خلاف عوام جاگ اُٹھے تو بھی یہ پریشان تھے۔ کہتے تھے اس ملک کو جمہوریت راس نہ آئے گی۔ ایوب خاں اچھا آدمی ہے۔ اس لیے اس کی چند ایک کمزوریوں کو بھی معاف کر دینا چاہیئے مگر وقت اپنا فیصلہ سنا چکا تھا۔ عوامی تحریک کے سامنے صدرِ ایوب کو ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ یعنی ایک بار پھر مارشل لا لگا۔ یہ پھر اُداس ہو گئے۔ تاسف کے لہجے میں کہتے تھے۔ پاکستان کا وجود ضروری ہے کیونکہ :۔

" پاکستان کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے جب چُھرا بازی کے واقعات عام ہو چکے تھے مَیں بمبئی میں مقیم تھا۔ ان تشدد بھرے واقعات کو دیکھ کر مجھے ہندوؤں پر غصّہ آنے لگا۔ آخر قیامِ پاکستان پر وہ اتنے مشتعل کیوں ہو رہے تھے۔ تشدد پر کیوں تُلے ہوئے تھے۔ سڑکوں اور گلیوں میں نہتے راہگیروں کو خنجر مارنے سے کیا پاکستان کے قیام کو روکا جا سکتا تھا؟ پاکستان میرے قریب آتا جا رہا تھا۔

چُھرا چلانے کی وارداتیں بڑھتی گئیں۔ نفرت کے جذبات کی وجہ سے غنڈوں کی طرف سے پیچھے ہٹتا گیا۔ پاکستان کے قریب اور قریب اور قریب، بھارت سے میری پیاُئی نفرت اور ڈر کی وجہ سے تھی۔ جس میں نفرت کا عنصر ڈر پر غالب ہوتا جا رہا تھا اور یہ نفرت کبھی کبھار اتنی شدّت اختیار کر لیتی کہ میرا جی چاہتا بھرے بازار میں نعرہ لگاؤں۔ اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد!

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن آگیا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ہم ریڈیو سیٹ کے پاس بیٹھے تھے۔ میں کسی کتاب کے مطالعہ میں محو تھا۔ دفعتاً اعلان ہُوا۔ ریڈیو پاکستان!۔ میرے ہاتھ سے کتاب چھُوٹ گئی۔ دل میں ایک ہوائی سی چھُوٹی۔ سارے وجود میں رنگین

ستارے ناچنے لگے۔ پاکستان کے لیے یہ میرا پہلا مثبت جذبہ تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کے کیمپوں میں مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ دیکھ کر، مشرقی پنجاب میں کُشت وخُون کے واقعات کے بارے میں سُن سُن کر، بھارت کے روّیہ کو دیکھ دیکھ کر یہ خیال مستحکم ہوتا گیا کہ پاکستان سے ہماری زندگی اور سلامتی وابستہ ہے۔

طبیعت کے لحاظ سے، میں بنیادی طور پر ایک مجذوب واقع ہوا ہوں۔ عام حالات میں مجھ پر کسی واقعہ کا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن جب اثر ہو جائے تو شل ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے اندر لاوا کھولنے لگتا ہے اور پھر گویا آتش فشاں جاگ اُٹھتا ہے۔

اب میرے لیے پاکستان ایک معمّہ ہے اور ایک پُراسرار سایہ بھی، پاکستان کے شانے پر کس کا پُراسرار ہاتھ ہے۔ پاکستان کی ناؤ کون کھے رہا ہے ——— پاکستان کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے؟ ——— اور کیوں؟"

یہ ان دنوں یہی سوچتے رہتے ہیں اور سوچتے سوچتے دُبلے ہو رہے ہیں۔ سرابِ تمنا سے بچنا چاہتے ہیں۔ اسبابِ تمنا پر غور کرتے رہتے ہیں اور نادیدہ قوّت کی سعیٔ کرم پر بھروسا کیے بیٹھے ہیں۔

اگر کوئی دنیا جہان سے تنگ آچکا ہو تو وہ ان کے پاس بیٹھ جائے۔ ساری کلفتیں بھول جائے گا۔ ادب بھی چلے گا۔ لطیفہ بھی چلے گا اور محفل میں ان کی موجودگی تقریباً مرکزی سی بن جائے گی۔ ایک بار ایک بے تکلف دوست نے ان سے پریشان ہو کر کہا "میرا پچھلے ماہ میں چار جگہ تبادلہ ہوا ہے۔ اس پر انھوں نے کہا۔ پشتو میں ایک ضرب المثل ہے کہ کتّا کابل سے ایک دن میں پشاور پہنچ گیا۔ حالانکہ راستہ تین دن کا تھا۔

"کیسے؟"

انہوں نے کہا "اب بات کتّے کی زبانی سنئے"۔ میں جس گاؤں میں جاتا تھا وہاں کے دو چار کتّے میرے پیچھے لگ جاتے تھے اور گاؤں سے باہر نکال کے دم لیتے تھے اور جب اگلے گاؤں میں پہنچتا تھا تو پھر ایک دو کتّے میرے پیچھے لگ جاتے تھے۔ غرض اسی طرح بھائی بندوں نے، ایک ہی دن میں کابل سے پشاور پہنچا دیا۔

حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ یہ بڑے ذہین افسر ہیں۔ ایک جگہ ٹک کے رہتے تو بڑے مفید کام کرتے۔ ان کی ذہانت اور دیانت ہی ان کی دشمن بنی ہوئی ہے۔ انہوں نے اس بات کے جواب میں کہا "تو پھر ساتھیوں نے باندھ کے مروایا ہوگا"۔

"وہ کیسے؟"

وہ ایسے کہ ایک شخص خودکشی کرنی چاہتا تھا۔ عزرائیل نے کہا "ایسا نہ کرو"۔

اس نے کہا "فاقوں مر رہا ہوں اور کوئی حل نہیں"۔

"حل ہے"۔

"وہ کیا؟"

"حکیم بن جاؤ"۔

"پھر؟"

"پھر یہ کہ مَیں جس کی پائنتی کھڑا ہو جاؤں سمجھ لینا وہ مر جائے گا۔ اس کا علاج نہ کرنا۔ جس کے سرہانے کھڑا ہو جاؤں اُسے جو چاہے دے دینا۔ وہ صحت یاب ہو جائے گا"۔

چنانچہ اس کا کاروبار خوب چمکا۔ ایک دن اُس نے دیکھا کہ عزرائیل خود اس کی پائنتی

کھڑا ہے۔ اُس نے جان لیا کہ وقت آن پہنچا ہے۔ جھٹ اُستادانہ داؤ چلا۔ پائنتی کی طرف سرہانہ رکھ کر اُدھر کی بجائے اِدھر لیٹ گیا۔ عزرائیل اِدھر آتا تو جھٹ سرہانہ اُدھر رکھ کر لیٹ جاتا۔ غرض اُس نے عزرائیل کو گھنٹوں ہی پائنتی کی طرف کھڑا ہونے کا موقع نہ دیا۔ مگر جب گھر والوں نے یہ نقشہ دیکھا تو سمجھے یہ پاگل ہو گیا ہے۔ انھوں نے حکیم صاحب کو رسیّوں سے باندھ دیا اور یوں عزرائیل کا داؤ چل گیا۔

مرتے مرتے حکیم نے کہا "میں نے مرنا تو نہیں تھا مگر تم لوگوں نے باندھ کے مروایا ہے"۔

ایسی باتیں عموماً زبانی ہوتی ہیں مگر یہ ایسے چٹکلے لکھنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ان کے کسی مضمون میں مَیں نے پڑھا ہے :-

"پرانے زمانے کی بات ہے۔ پنجاب کے کسی علاقہ میں ایک راجہ حکومت کرتا تھا۔ ریاست میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اناج وافر تھا۔ زمین زرخیز تھی۔ راجہ لوگوں کی خوش حالی پر پھولے نہ سماتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں کبھی کبھار بیٹھے بٹھلائے راجہ کو شک پڑ جاتا کہ حالات تسلّی بخش نہیں ہیں اور وہ فکرمند ہو جاتا۔ ایک روز جب راجہ اپنے درباریوں کے ساتھ کسی اہم تقریب پر جا رہا تھا تو دفعتاً وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ وزیر سے کہنے لگا۔ دیکھو ہمیں کسی نے یاد نہ دلایا اور ہم سر پر پگڑی رکھے بغیر ہی آ گئے۔ پگڑی کے بغیر تقریب میں شمولیت کرنا کتنا معیوب ہو گا۔ یہ سُن کر وزیر نے خدمت گزار کو حکم دیا۔ بولا محل میں جاؤ اور مہاراج کی پگڑی لے آؤ۔ جب تک ہم یہیں انتظار کریں گے۔

اتفاقاً کسی درباری کی نگاہ راجہ کے سر پر پڑی دیکھا کہ پگڑی راجہ کے سر پر ہے۔

درباری نے عرض کیا۔ حضور پگڑی تو سرِ مبارک پر موجود ہے۔ راجہ نے ہاتھ اٹھا کر پگڑی کو ٹٹولا۔ پا کر اطمینان کا سانس لیا اور کہنے لگے۔ بہت اچھا کیا تم نے ہمیں بتلا دیا ورنہ ہم یہاں ننگے سر ہی کھڑے رہتے۔"

بھلا ایسی باتیں کرنے والے رفیق سے کبھی بھی کوئی شخص اُکتا سکتا ہے؟ اُکتانا تو کجا خطِ غلامی لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ شخصیت کا سحر نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ ملنے والوں پر واقعی ایسا تکلّمی جادو کرتے ہیں کہ پھر کوئی ان کی چوکھٹ کو چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ اسمِ اعظم کی پھونک مار دیتے ہوں۔

یہ جب بھی اپنے کسی دوست سے ملیں گے اس کی بہت تعریف کریں گے۔ مثلاً اشفاق احمد سے ملیں گے تو اسے کہیں گے۔ یار میں نے اس مسئلے پر کئی بار سوچا ہے کہ ہماری کھیپ کے بعد، جس نے سب سے اچھے افسانے لکھے وہ تُو ہے۔ تیرے پاس جتنے موضوعات ہیں۔ اُتنے کسی دوسرے افسانہ نگار کے پاس نہیں۔ پھر اگر تُو افسانہ نویس نہ بھی ہوتا تو بھی تُو ریڈیو آرٹسٹ کی حیثیت سے یگانہ ہے۔ غرض تو نہیں جانتا کہ تُو کیا ہے۔

بانو قدسیہ سے ملیں گے تو کہیں گے۔ بانو تیرے افسانوں میں بڑی جان ہے۔ علم ہے۔ مطالعہ ہے جو کسی اور خاتون کے حصے میں نہیں آیا۔ پھر یہ ہے کہ تیرا بات کہنے کا انداز اپنا ہے۔ دو سطریں پڑھو۔ معلوم ہو جائے گا کہ یہ تحریر بانو کی ہے۔ یہ وصف یا تو عصمت میں ہے یا تجھ میں ہے اور کسی میں نہیں۔ پھر تیرے ڈرامے! کیا کہنا ان کا بھی، اس معاملے میں تو تیرا حریف بھی کوئی نہیں۔

ان کے نزدیک ایسی گفتگو کرنا بہت ضروری ہے کیوں کہ قدم قدم پر قلم گھسیٹ

(ٹانگ گھسیٹ سے) قسم کے لوگ ملتے ہیں۔ اگر کوئی لکھنے والا کسی سے دو چار جملے حوصلہ افزائی کے بھی نہیں سُنے گا تو وہ بد دل ہو جائے گا۔ فن کار کو اگر بڑھاوے نہ ملیں تو اس کے فن کو پھپھوندی لگ جاتی ہے۔

خود عجیب ہیں۔ اس لیے ان کے مسئلے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کوئی بات قاعدے کے مطابق نہیں۔ کوئی قصّہ ضابطے کے مطابق نہیں۔ لااُبالی پن ہر بات میں، بڑے سے بڑے مسئلے کو بھی ہنسی کھیل سمجھنا۔ چنانچہ اسی طرح کا ایک مسئلہ ان کی کتابوں کی اشاعت کا بھی ہے۔

اِن کی پہلی کتاب "اَن کہی" اس لیے چھپ گئی کہ انہیں ایک عدد گراموفون مطلوب تھا کیوں کہ یہ عرصے سے محبّت فرماتے چلے آ رہے تھے اور نتیجے میں سہگل کا گایا ہوا ریکارڈ "اب دن بیتت نہ ہیں دُکھ کے" اُٹھائے پھر رہے تھے۔

"گھاگھی" اس لیے چھپی کہ کریانہ اسٹور کے مالک لالہ ہر دیال سنگھ کے نوکر نے آستینیں چڑھا لی تھیں، کچہری تک گھسیٹنے کی دھونس دے دی تھی۔ اگر وہ اپنی رقم کا مطالبہ اس آرٹسٹک طریقے سے نہ کرتا تو "گھاگھی" نہ چھپتی۔

"غبارے" کی اشاعت اس لیے وجود میں آئی کہ فلم اسٹار اور پروڈیوسر پرمیلا دیوی، مفتی کو دیکھ کر ذرا سی مُسکرا دی تھیں۔ لہٰذا اس مسکراہٹ کا جواب دینے کے لیے انہیں بمبئی جانا پڑا تھا۔ کرایہ کی خاطر "غبارے" چھپوا ڈالی۔

"علی پور کا ایلی" اس لیے چھپی کہ ان کا افسر اِن سے ناراض تھا۔ انہوں نے ان سے سارا کام واپس لے لیا تاکہ انہیں فالتو آدمی بتلا کر نکالا جا سکے۔ جب کوئی کام نہ

ہو تو ایک ادیب سوائے لکھنے کے اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے محض وقت گزارنے کے لیے، اُن دو برسوں میں "علی پور کا ایلی" لکھ ڈالی۔ نہ افسر ناراض ہوتا نہ یہ کتاب چھپتی۔

مجبوریاں بھی بعض اوقات، انسان سے ڈھنگ کے کام کرا لیتی ہیں۔ فیض احمد فیض گرفتار ہوئے تو سبھی کو افسوس ہوا مگر اس گرفتاری میں خوشی کا پہلو یہ تھا کہ انہوں نے محض، وقت گزارنے کے لیے "دستِ صبا" ایسا مجموعہ دے ڈالا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ جب ان پہ لیاقت علی خاں کے زمانہ میں بغاوت کا مقدمہ چل رہا تھا۔ پھر ایوب خاں کا دَور آیا تو اُس نے محض احتیاط کی خاطر، انہیں گرفتار کر لیا تھا۔ تب انہوں نے وقت گزارنے کے لیے "زنداں نامہ" لکھی۔ اسی طرح ممتاز مفتی کی بھی مجبوریوں کی وجہ سے کئی کتابیں منصۂ شہود پر آئیں۔ ایک نے جیل جا کر لکھا۔ دوسرے نے گراموفون کے لیے، فالتو وقت گزارنے کے لیے، قرض ادا کرنے کے لیے، پرمیلا دیوی کی مسکراہٹ کا جواب دینے کے لیے!

پرمیلا دیوی کی مسکراہٹ پر یہ لاہور سے بمبئی چلے گئے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ مسکراہٹیں ان کی کمزوری بن چکی ہیں۔ وہ پرمیلا دیوی ہو یا شہزاد، ساوی ہو کہ تسلیم، انہوں نے مسکراہٹوں کا جواب اُسی مفہوم میں دینا ہے۔ جیسا کہ ضروری ہوگا یا جیسا کہ وہ شوخ چاہیں۔ خواہ اس عبادت میں، ان پر جو کچھ بھی گزر جائے اور یہی وہ عبادت ہے جس نے ان کی زندگی میں رنگ بھر رکھے ہیں۔

ایک شوخ کا بیان، اُن کی زبانی یوں ہے:۔

"اچھا (وہ ہنسی) اگر وہ یاد بھی نہیں آتی تو پھر فائدہ ہی کیا ہوا؟"

"فائدہ ؟" اُس نے شہزاد کی اُڑتی ہوئی لٹ کی طرف دیکھا۔

"اچھی محبت ہے یہ" وہ بولی۔

ایلی کا دل چاہتا تھا کہ اُٹھ کر بھاگ جائے۔ وہ قرب جیسے اِسے چھیڑ رہا ہو۔ اس کی قوتِ عمل دھندلائی جا رہی تھی۔ نہ جانے اس قرب کی وجہ سے یا کسی اَن جانے، اَن کہے ڈر سے، جو ان کی نسوں میں دھنکی کی طرح بج رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اُس نے بات کرنے کی کوشش کی تو اُس کی آواز کی لرزش راز فاش کر دے گی۔

"میں پانی پی لوں" ایلی نے گھبرا کر کہا۔

"میں پلاتی ہوں تمہیں پانی" شہزاد اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ایلی کا بھاگ جانے کا یہ بہانہ بھی بے کار ہو کر رہ گیا۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ گھڑے کے پاس کھڑی شہزاد گلاس میں پانی ڈال رہی تھی۔ اس کے گرد چاندنی اور اندھیرے کی بساط بچھی تھی اور اس بساط پر ملکہ بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر اُڑتے ہوئے بالوں کا تاج تھا۔ "یہ لو" شہزاد کا سُرخ ہاتھ اس کی طرف بڑھا۔ ناگ نے پھن اُٹھایا۔ ایلی جھجک کر پیچھے ہٹا۔

"لو بھئی" ہاتھ اور قریب آ گیا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ پانی کے گلاس کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑے اور پھر — پھر — مگر پھر کے متعلق اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک سُرخ دھندلکا۔ پخ پخ — ایک چمگادڑ کہیں قریب سے ایلی کی طرف لپکی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ شہزاد نے گلاس چھوڑ دیا۔ ایلی شرابور ہو گیا شہزاد کی سریلی ہنسی سے فضا گونجنے لگی۔

"بالکل ہی مجنوں بن گئے" وہ چلائی "لاؤ میں پونچھ دوں" وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھی۔ سُرخ ناگ نے پھن پھیلائے۔ پھر اس کی طرف لپکا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ سُرخ دیوانگی

اس پر مسلّط ہوگئی ۔

اس نے ایک کر رنگین سانپ کو ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ جیسے وہ سپیرا ہو اور اپنی طرف کھینچا۔ نہ جانے محض جنون کی وجہ سے، محبت سے، نفرت سے یا اُس خوف کی وجہ سے جو اس پر مسلّط و محیط تھا۔ اس کی دیوانگی اور بھی شدید ہوگئی۔ اُس نے جھٹکا دے کر اُسے دیوانہ وار اپنی طرف کھینچا۔ یوں بے دردی سے کھینچا۔ جیسے شہزاد محض ایک رنگین گڑیا ہو۔ شاید وہ اسے دانتوں سے کاٹنا چاہتا تھا تاکہ کاٹے جانے سے پہلے اس کی گردن چبا لے اور اپنے آپ کو محفوظ کرلے لیکن اس کے گرم لمس سے ایلی کے ہونٹ جلنے لگے۔ اور اَن جانے میں اُس نے اسے دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔ شہزاد چارپائی پہ یوں گر چکی تھی جیسے ایک بار پھر "ایلی تم؟" — وہ ہونک رہی تھی ۔

ایلی کی نگاہ میں وہ زرد چاندنی سُرخ ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے فضا میں گلال کی پچکاریاں چل رہی ہوں۔ عین اُس وقت ملحقہ کوٹھے سے پاؤں کی چاپ سنائی دی — فرحت چلّاتی ہوئی آرہی تھی۔ "تم سو گئے کیا؟" فرحت کی آواز سُن کر وہ خونیں طلسم ٹوٹ گیا ایلی کی گرفت دفعتاً ڈھیلی پڑ گئی۔ گٹھڑی لپک کر کھڑی ہوگئی اور ایلی لیٹ کر یوں چپ چاپ پڑ گیا جیسے دیر سے سو رہا ہو ۔

چارپائی پر پڑے پڑے وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے سر پر اندھیرے کا ایک بڑا ٹکڑا منڈلا رہا تھا اور شیش محل کی سب سے اُونچی منزل مٹیالی چاندنی میں اپنی بے نور کھڑکیوں سے اس کی طرف گھور رہی تھی۔ قریب ہی شہزاد فرحت سے باتیں کرتے ہوئے ہنس رہی تھی ۔

شہزاد کی ہنسی سن کر وہ چونک پڑا۔ وہ ہنس کیوں رہی تھی۔ وہ باتیں کیوں کر رہی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ شاید وہ اس کی اس حرکت کو درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھتی ہو۔ اس خیال پر وہ کانپ گیا۔ اگر اس نے اس بات کو اہمیت نہ دی تو ـــ اس کے ماتھے پہ پسینہ آگیا اور وہ اضطراب میں کروٹیں بدلنے لگا۔

"لو یہ اور دیکھو"۔ شہزاد ہنسی۔" ویسے سویا ہوا ہے لیکن کروٹیں لے رہا ہے"۔

فرحت نے سنجیدگی سے کہا۔"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کبھی خیال نہیں کیا۔ سوتے میں ہمیشہ کروٹیں لیتا ہے"۔

"اچھا"۔ شہزاد کی آواز میں طنز تھی۔" سوتے میں جاگتے کی سی حرکتیں کرتا ہے اور جاگتے میں سوتے کی سی عجیب بات ہے"۔

آہستہ آہستہ فرحت اور شہزاد کی باتوں میں وقفے بڑھتے گئے اور چوگان کی جھمگا ڈروں کی چیخیں مدھم پڑتی گیئں۔ حتیٰ کہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا"۔

یہ اقتباس" علی پور ایلی" میں سے ہے (صفحہ نمبر ۳۱۵ سے ۳۲۰ تک) جس کی میں نے ڈیڑھ دو صفحوں میں ریڑھ ماری ہے۔ اگر میں ان چھ صفحوں کو بھی پورا کا پورا نقل کر دیتا تو بھی لطف آجاتا۔ شدید تاثرات و محسوسات کا حال تو ان سطروں میں آ ہی نہیں سکا۔ یعنی فن کو خارج کر کے صرف واقعہ کو لے لیا۔ روح غائب، قالب موجود والا قصہ ہو گیا۔ پھر میں نے چالاکی یہ کی۔ دو سطریں کہیں سے لے لیں، دو سطریں کہیں سے لے لیں۔ مفتی ناراض ہوں گے مگر کیا کروں؟ نقادوں کی تیوریوں کا پاس مجھے کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ کہیں گے اتنے لمبے لمبے اقتباسات؟ بہر حال جو ہو گیا۔ سو ہو گیا۔ مجھے کبھی بھی اپنے

مضمون کی بہتری کا خیال نہیں رہا۔ مگر یہ خیال ضرور رہا کہ جس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ وہ ہر طرح سے سامنے آئے۔ ہر رنگ میں سامنے آئے۔ ورنہ مندرجہ بالا واقعہ کوئی دہرانے والا تھا؟

حد ادب والی بات اپنی جگہ، اس کی نزاکتوں کا احساس بھی اپنی جگہ، مگر واقعات سے ایمانداری کا رشتہ قائم نہ رکھنا بھی تو زیادتی ہے۔ ویسے میں بھی کیا کروں جب کہ "علی پور کا ایلی" بھی ایسی ہی فتوحات سے بھری پڑی ہو۔ آخر ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ طبیعت بھی رواں تھی اور ماحول بھی سازگار! ایک عینی شاہد کہتے ہیں کہ یہ اپنے وقت میں بہت طرح دار تھے۔ ۱۹۳۵-۳۶ء میں کوئی کوئی ہی سوٹ بوٹ سے آراستہ نظر آتا تھا اور یہ اُس زمانے میں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ سُوٹ پہنتے تھے۔ پھر جب یہ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر نکلتے تھے تو قیامت ڈھا دیتے تھے۔ خُوب رُو اس پہ خوش پوشاک! غرض جدھر سے بھی گزر جاتے تھے۔ کھڑکیوں میں سے، چوڑیوں کے چھناکوں ہی کی آوازیں آتی تھیں۔

ایک دن مَیں ان کے ہاں اچانک جا نکلا۔ میں جس کام کے سلسلے میں اسلام آباد گیا تھا، اس میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ یعنی متعلقہ افسر سے دو گھنٹے بعد ملاقات ہو سکتی تھی۔

"مہمان خانہ" سے نکل آیا تھا۔ ڈرائیور نے پوچھا "اب کدھر؟" پردیس میں بعض اوقات تھوڑا سا وقت گزارنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ غریب الوطنی کا رونا، شاعروں نے کوئی یونہی تھوڑا رویا ہے۔ حالانکہ میں اُس وقت غریب الوطن نہ تھا۔ صرف غریب شہر تھا۔

اب کدھر کے جواب میں، مَیں نے کہا "شہر چلو"

اب جیسے جیسے شہر (یعنی راولپنڈی) قریب آرہا تھا۔ ویسے ویسے سوچوں میں بھی کشتی شروع ہوگئی۔ رَد وقبول کی جنگ، فلاں دوست کے ہاں چلوں؟ — نہیں، فلاں کے ہاں — نہیں! باآخر فیصلہ ممتاز مفتی کے ہاں جانے کا ہوا۔ یہ میرے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں، اس کا اندازہ اُس دن ہوا۔ پہنچا تو دیکھا کہ ٹیپ ریکارڈر کھُلے ہیں۔ ایک نہیں دو! میں نے پوچھا "دو دو کیوں؟"

"اس لیے کہ میں سارا دن گانے سُنتا رہتا ہوں۔ اگر میوزک نہ بج رہا ہو تو میں لکھ ہی نہیں سکتا۔"

"انگریزی میوزک سُنتے ہیں؟"

"نہیں اپنے ہاں کے! — پرائی چیزوں کا میں قائل ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے مستعار نظریات سے بھی چڑ ہے۔ میں تو اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی کا قائل ہوں۔"

ان کے پاس دو موٹی موٹی کاپیاں ہیں جن میں ضروری معلومات درج کر رکھی ہیں۔ حتیٰ کہ خواب تک، مطلب یہ کہ جب سے ان پر روحانیت کا غلبہ ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی "ڈائریاں" عجیب وغریب حالات واقعات سے مزّین کر رکھی ہیں۔ جن میں سے بیشتر باتیں ناقابلِ یقین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی سوانح کا دوسرا حصّہ (ایلی اور الکھ نگری) چھپوانے سے گریزاں ہیں۔ کہتے ہیں۔ ایسی باتوں پر کون یقین کرے گا؟

میں نے پوچھا "پہلے حصّے پر کس نے یقین کیا تھا؟"

"ادیب ان مخمصوں میں نہیں پڑتا کہ ان کی تحریروں پر کون یقین کرے گا اور کون نہیں۔ اسے بس لکھنا ہوتا ہے۔ اپنی باتیں کہنی ہوتی ہیں۔ اندر کا لاوا اگلنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں دس بارہ برس سے دوسرا حصّہ لکھ رہا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ لوگ کہیں گے۔ لیجئے" مجذوب کی بڑوں" میں ایک اور اضافہ ہوا مگر ایسا کوئی آدمی، میری تحریر کو مجذوب کی بڑ نہ کہے گا۔ جس کا دل درد آشنا ہوگا۔

ان کا معاملہ، ایک پبلشر سے پٹ نہیں رہا تھا۔ یعنی معاہدے کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔ انھوں نے بہ طور ثالث مجھے مقرر کیا اور لکھا" جو تم فیصلہ کر لو گے۔ میں اُس پر آنکھیں بند کر کے صاد کر دوں گا۔"

میں نے اپنی طرف سے بڑی کوشش کی کہ معاملہ سُلجھے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر عاجز آکر، ایک ملاقات پر ان سے کہا" یہ معاملہ مجھ سے سُلجھ نہ سکے گا۔"

"یہ مجھے معلوم تھا۔"

"اگر آپ کو معلوم تھا تو پھر مجھے ثالث کیوں بنایا تھا؟"

"میری مرضی۔"

"آخر کیوں؟"

"میں جانتا تھا کہ جو شخص خود اپنے معاملات نہ سُلجھا سکتا ہو۔ وہ دوسروں کے معاملات کیا سُلجھائے گا۔ مگر میں نے تمہیں ثالث اس لیے بنایا تھا کہ دوستی کا تقاضا یہی تھا۔"

مفتی نے عکسی سے ملاقات کرائی" یہ میرا بیٹا ہے۔"

"اچھا وہی، جسے آپ اپنا دوست[1] بھی سمجھتے ہیں۔"

---

[1] واقعی یہ ان کے دوست ہیں۔ دوست وہی ہوتا ہے نا، جو سب کچھ جانتا ہو۔ سب ہی کچھ!

"ہاں وہی!"

"کیا کر رہے ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"اس کے بارے میں کیا کہوں؟ مَیں خود اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ جو زندگی گزارتے ہیں بلکہ اُن لوگوں میں سے ہوں۔ جن پر زندگی گزرتی ہے۔ زندگی بھر میں نے خود کوئی راہ نہیں نکالی۔ راستے آتے گئے اور میں انہیں ناپتا گیا۔"

"پھر بھی؟"

"یہ بے قاعدہ زندگی گزارنی چاہتا ہے۔"

"کیا آپ نے اس کی اجازت دے دی ہے؟"

"کیا حرج ہے؟"

"زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ سوچنا ہی چاہیئے۔ کسی نہ کسی ضابطۂ حیات کو اپنانا ہی چاہیئے۔"

"بات یہ ہے کہ بعض لوگ خود ساختہ سرابوں کی وجہ سے، اپنی زندگی کو باقاعدگی کے ساتھ تباہ کرتے ہیں اور بعض اپنی زندگی بے قاعدگی کے ساتھ تباہ کرتے ہیں۔ ہمارا یہ ہے کہ حالات ہمیں جس طرح تباہ کرنا چاہتے ہیں کر لیں۔ اللہ اللہ خیر صلّا!

سب کہتے ہیں کہ مفتی میں کسی بات کو راز میں رکھنے کی اہلیّت نہیں۔ میں بھی ہُنکارتے ہوئے ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔

ان کے دفتر میں، کسی شخص نے کوئی غلط کام کر دیا۔ انہیں متاثرہ شخص سے ہمدردی تھی۔ ہفتوں بات کو اٹھائے پھرتے رہے مگر کب تک؟ ایک دن انہوں نے، اپنے ایک

ساتھی کو بڑے ہی راز میں لے کر، سب کچھ بتا دیا۔ مگر اسے تاکید کر دی۔ یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔ پھر وہی بات دوسرے شخص کو بتادی۔ اس سے بھی کہہ دیا۔ کسی کو بتانا نہیں۔ کسی اور کو بھی وہی بات بتادی۔ یوں سب کو تاکیدوں پہ تاکیدیں کرتے رہے مگر نوبت بہ اینجا رسید کہ اُس غریب کی انکوائری ہوگئی — مگر اس میں ان کا کیا قصور؟

احمد بشیر جو ممتاز مفتی کا بہت پرانا دوست ہے۔ اس کے مضمون سورما میں سے میں نے اکیس سطریں نکالی ہیں۔ جو بہت کام کی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر کسی شاعر کے دو چار شعر بھی زندہ رہنے والے ہوں تو وہ بڑا شاعر ہوتا ہے۔ میں نے تو ان کے مضمون سے "چودہ شعر" نکالے ہیں۔ مثلاً :-

۱۔ وہ اپنی حماقتوں کا علانیہ اظہار کرنے سے نہیں گھبراتا۔ بلکہ اُسے اپنی کئی ایک حماقتوں پر ناز ہے۔ وہ دوستی، محبّت، ایثار اور قربانی کو حماقتیں سمجھتا ہے۔

۲۔ ممتاز مفتی حتی الوسع جھوٹ نہیں بولتا۔ مگر یہ خوبی عمدہ اخلاق کا نتیجہ نہیں۔ کیونکہ اس کے نزدیک جھوٹ یا سچ بولنے کا عمدہ اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔

۳۔ اس میں راز داری کی اہلیت بے شک ہے مگر وہ اس اہلیت کو استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔

۴۔ وہ اپنی ذہنی اُلجھنوں سے بہت ڈرتا ہے۔ اگر اُسے بتا دیا جائے کہ وہ نوکری سے برخاست کر دیا گیا ہے تو وہ ایک لمحہ کے لیے پریشان ہو جائے گا مگر فوراً ہی اپنے آپ کو اس مشکل کے لیے تیار کرلے گا۔

۵۔ اس کی طبیعت کی افتاد ہی ایسی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے حادثہ پر بھی سنّاٹے میں

نہیں آتا۔ عزیز ترین دوست کی موت پر بھی اُسے دھکا نہیں لگتا۔

۶۔ وہ زیادہ بلند اُمیدیں اور توقعات استوار نہیں کرتا تاکہ پوری نہ ہونے پر اُسے دُکھ نہ پہنچے۔

۷۔ اُسے سپنے دیکھنے کی عادت ہے۔ عام طور پر جب اُسے سائیکل پر کہیں دُور جانا ہو۔

۸۔ کام کرنے بیٹھتا ہے تو اس کا سارا وقت اِدھر اُدھر کی معمولی ضروریات کو پورا کرنے میں کٹتا ہے اور کام ایک ضمنی چیز بن کے رہ جاتا ہے۔

۹۔ ممتاز مفتی وقت کے احساس سے قطعی آزاد ہے۔ اس کا کلاک کبھی ٹھیک وقت نہیں دیتا۔

۱۰۔ اس کی روزانہ زندگی میں سُستی کا جذبہ بے حد کارفرما ہے۔ وہ اپنی کاہلی اور ناکارہ پن کو جانتا اور علانیہ تسلیم بھی کرتا ہے۔

۱۱۔ ممتاز مفتی نے اپنے گردوپیش کی ہر ایک چیز میں ایک عجیب سی دو رُخی کو شدت سے محسوس کیا ہے۔

۱۲۔ وہ صبح سویرے ہی اُٹھ بیٹھتا ہے اور اس جگہ سے اُٹھ کر جہاں سویا ہوا تھا۔ کسی اور جگہ پر جا کر پھر سو جاتا ہے۔

۱۳۔ ممتاز مفتی مجلسی آدمی نہیں۔ وہ کسی کو ملنے سے ہچکچاتا ہے۔ اُسے گھر بیٹھے رہنے کا بے حد شوق ہے۔

۱۴۔ ممتاز مفتی ایک ایسا بچہ ہے جو یہ پسند نہیں کرتا کہ اُسے کوئی بچہ سمجھے۔

مجھے مندرجہ بالا "شعروں" کی صداقت پر پورا بھروسہ ہے۔ میں جمعہ جمعہ آٹھ دن

کی دوستی میں زیادہ لمبے چوڑے دعوے نہیں کرسکتا۔ وہ تو بقول شخصے اتنے پُرانے دوست ہیں کہ اتنے پرانے دشمن بھی نہیں ملتے۔ بس اتنا ہے کہ وہ مضمون تقریباً چوتھائی صدی پہلے کا لکھا ہوا ہے اگر وہ اس مضمون کا دوسرا حصّہ لکھیں گے تو پھر بہت سی نئی باتیں بھی سامنے آئیں گی۔ بے شک مفتی خود تو ویسے کے ویسے ہی ہیں لیکن ان کا ذہن بدل رہا ہے۔

چلتے چلتے ایک اور گزارش بھی کرنی چاہتا ہوں اور یہ گذارش اُسی کھاتے میں سے ہے جس کا ذکر، میں نے ابتدا ہی میں کر دیا تھا مگر میں یہ بات دھیمے لہجے میں کرنی نہیں چاہتا۔ قدرے بلند آواز میں کہتا ہوں کہ مفتی نے ہمیں جا بجا یہ سمجھایا ہے کہ "میں تو شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں"۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ بلکہ یہ حربہ، اپنی طرف توجہ مبذول کرانے کا ایک خوبصورت سا انداز ہے۔ بھلا وہ شخص جو پہلے دن سے مرکزِ توجہ رہا ہو۔ وہ اس چکّر میں کیسے پڑ سکتا ہے؟ یہ زبان سے کچھ ہی کہتے رہیں۔ لکھیں بھی جو ان کا دل چاہے مگر واقعہ تو یہ ہے کہ یہ جہاں تہاں سب پہ چھائے ہی رہے۔ شک ہو تو "علی پور کا ایلی" پڑھ لیجئے گا مگر اس سلسلے میں احتیاط صرف اتنی کرنی ہوگی کہ ان کی تحریر کی بجائے، اپنے ذہن کو کسی فیصلے پر پہنچنے دیجئے گا۔ تب آپ کو احساس ہوگا کہ یہ چال تو صرف ہمیں احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کے لیے تھی[1]۔ توبہ توبہ کتنا چالاک ہے یہ شخص!

(۲)

جی تو یہ چاہتا ہے کہ اس مضمون کے سلسلے میں، اپنے سارے علم کو نچوڑ کے رکھ دوں

---

[1] یہاں تک یہ مضمون نقوش کے شمارہ نمبر ۱۱۵ میں چھپ چکا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ علم ہو تو، میرا اثاثہ یادوں کا اثاثہ ہے۔ اُسے جتنا کھنگال لیجئے تصویریں ہی اُبھریں گی۔ کچھ دھندلی، کچھ واضح، مگر جسے علم کہتے ہیں وہ اپنے ہاں سے برآمد نہ ہوگا۔ پھر بھی بقول رشید احمد صدیقی، اس اظہار کو میری کسرِ نفسی پر نہیں، میری دانش مندی پر محمول کیجئے گا۔

میں نے اس مضمون کے سلسلے میں، زیادہ تر کوشش اس امر کی کی کہ اپنے ذہن کو زحمت دینے کی بجائے مفتی صاحب کو اُن کی تحریروں سے ہی برآمد کروں تاکہ اخلاق و کردار کے اصول و اقدار، جو کچھ بھی ہوں۔ وہ ان کے اپنے ہوں اور میرا وجود محض قلمی تماشائی کا ہو۔ مگر اس کھیل میں خود تماشا بن گیا۔ بہرحال شخصیت نگاروں کو، ان کی شخصیت میں جھانکنے کا، ایک چور رستہ میں نے بھی بتا دیا ہے۔ وہ چاہیں تو اس پر بھی غور کر لیں ورنہ میری ہی طرح، بغیر واردات کیے کانوں کو ہاتھ لگا لیں۔ مَیں جو ملوث ہوا وہ تو ہوا۔

احمد بشیر، ممتاز مفتی کے بڑے یار ہیں۔ کشور ناہید، احمد بشیر کی دوست ہیں۔ ایک مضمون جو ممتاز مفتی پر، احمد بشیر نے لکھا تھا۔ اس کا تھوڑا سا احوال اوپر میں نے بیان کیا ہے۔ اب تھوڑا سا ذکر اس مضمون کا بھی ہو جائے جو احمد بشیر نے کشور ناہید پر لکھا تھا۔ یہاں یہ تذکرہ خواہ مخواہ کا نہیں ضرورت کی پاداش میں ہے۔

مجھے اُس مضمون کا علم اخبارات کے کالموں سے ہوا۔ تھُو تھُو کا شور ہر محفل میں سُنا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ مضمون میں بھی دیکھوں، دیکھوں ہی نہیں بلکہ پڑھوں بھی، کیونکہ معاملہ برادری کا تھا اور برادری کا ایک رُکن رگیدا جا رہا تھا۔ یہاں مجھے اُس مضمون کے حُسن و قبح پر بات نہیں کرنا ہے بلکہ آپ کو یہ بتانا ہے کہ اُس مضمون کے سلسلے میں ایک خط مفتی صاحب نے احمد بشیر کو لکھا تھا جو کہ یہ تھا:

"احمد بشیر! —— میں نے تمہیں اور طفیل صاحب کو کشور ناہید کے اسکیچ کی ایک ایک کاپی بھیج دی ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ تم اس اسکیچ پر نظر ثانی کر رہے ہو تو میری چند باتیں سن لو۔ مانو نہ مانو تمہاری مرضی! اسکیچ لکھنے والے کے لیے لازم ہے کہ اُسے صاحبِ کردار سے بے پناہ ہمدردی ہو۔ مصنّف خود کو پس منظر میں رکھے۔ اگر اُبھرے تو اتنے عجز سے کہ صاحبِ کردار دھندلائے نہیں اور آخری بات یہ کہ مصنّف خود کو شوخ رنگوں میں نہ اُبھارے!"

مفتی صاحب کا یہ رویّہ، وہ شریفانہ رویّہ ہے جو ان کی شخصیت کا صرف ایک پُھندنا ہے۔ ایسے پُھندنے ان کی شخصیت میں اور بھی بہت سے لگے ہوئے ہیں۔ ویسے اس خط سے آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ مضمون جس پر اتنا اودھم مچا تھا۔ اُسے پڑھنے کا موقع مجھے بھی ملا۔ اُس اسکیچ کے بارے میں میری مختصر رائے یہ ہے کہ وہ مضمون اتنا سچّا ہے کہ ننگا ہو گیا۔ لہجہ اتنا بے باکانہ ہے کہ افسانہ بن گیا۔

ایک نئے افسانہ نگار نے جنہیں اپنی افسانہ نویسی پر بہت غرّہ تھا (جیسا کہ عموماً ہوتا ہے) انہیں اپنا ایک افسانہ سنا ڈالا۔ تخلیق کی تڑپ سبھی میں ہوتی ہے مگر سوال یعنی تخلیقی تڑپ کا ہوتا ہے۔ آفاق کو پلکوں پہ جُھلانے کا ہوتا ہے۔ انہوں نے افسانہ سُنا تو چُپ ہو گئے۔

انہوں نے اصرار کیا۔ "رائے؟"

یہ چپ رہے۔

اصرار بڑھا تو انہوں نے کہا۔ "تُو جوہڑ میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں پھینکنے کے فن کو ترک کر دے۔"

افسانہ نویس نے کہا" میں تو اپنی روش کو بدل نہیں سکتا۔"

"نہیں بدل سکتا تو نہ بدل، میرا کیا ہے ؟"

افسانہ نویس نے پوچھا" حضرت یہ تو آپ نے فرمادیا کہ موجودہ روش کو ترک کر دوں لیکن یہ نہیں بتایا کہ آخر کونسی روش کو اختیار کروں ؟"

"تو جوہڑ میں اتنا بڑا پتھر پھینک دیا کر کہ کثیف پانی کی بوند تک نہ بچے۔"

یوں تو یہ بات انہوں نے کسی دوسرے افسانہ نگار سے کہی۔ لیکن یہ رُخ اُنکے اپنے مزاج کا بھی ہے۔ یہ اشاروں اور کنایوں میں بات نہیں کرتے۔ یہ پھولوں کی چھڑی سے کام نہیں لیتے بلکہ سیدھے لٹھ باز ہیں۔ یہ سو سنار کی نہیں، ایک لوہار کی، کے قائل ہیں۔ یہ ننگی تلوار ہیں۔ میٹھی چھُری نہیں۔ یہ افکار کے حلقے نہیں بناتے بلکہ افکار کے بیج بونے والوں میں سے ہیں۔ یہ پھُنکے چلے جانے کے قائل نہیں بلکہ بہ احتیاط پھُونک دینے کے قائل ہیں۔

یہ بہت سی رواداری اور بہت سی اصولی باتوں کو کلیجے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کا دل اگر بُجھا بھی ہے تو بھی یہ دل کی وفات کے قائل نہیں۔ اصول اصول، یہ ان کا نعرہ نہیں تو وطیرہ ضرور ہے۔ مگر یہ کہنے کو ابھی یہ بھی کہہ دیں گے۔ اصولوں پر عمل پیرا ہونا احمقوں کا شیوہ ہے۔ بات دُور نکل جائے گی۔ اس لیے سادہ سے الفاظ میں یہ عرض کر دوں کہ یہ معاملات کے بہت کھرے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کم از کم اس عاجز پر ان کا رعب اسی نوعیت کا ہے۔

میرے ساتھ ان کی معاملت یوں رہی کہ پہلے پہل یہ مجھے بلا معاوضہ ہی اپنی تخلیقات

مرحمت فرمایا کرتے تھے۔ قلم کی زکوٰۃ کے طور پر نہیں بلکہ بربنائے خلوص، پھر بیچ میں پیچ ایسا پڑا کہ یہ نوکری سے الگ ہو گئے۔ "دانے دُنکے" کی فکر پڑ گئی۔ اُن دنوں میں نے اپنے طور پر حاتم طائی بن کر، انہیں ہر افسانے کا معاوضہ دیا۔ بلکہ اُن دنوں جب معاوضہ بھیجنے میں تاخیر ہوتی تھی تو اُن کی طرف سے یاددہانی کا خط بھی آجاتا تھا۔ یوں سلسلہ چلتا رہا۔ جمع تفریق ہوتی رہی۔ فن کے قلعے سر ہوتے رہے۔

ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا۔ "میں خاندانی شجرے کے متعلق تم سے کچھ چھپوانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ اس پر لاگت کیا آئے گی تاکہ پیشگی ادا کردوں؟"

یہ سُن کر میرا ذہن جھنجھنا اُٹھا۔ میں نے بہت ہی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مسودہ مجھے دیجئے۔ چھپ جائے گا۔"

اِن کا مروّت سے خالی جواب یہ تھا۔ "اگر تم مجھ سے قیمت وصول نہیں کروگے تو میں چھپواؤں گا ہی نہیں۔"

اِس جواب پر مجھے پھر تارے نظر آنے لگے۔ فرطِ شرم سے بھیگ گیا۔ ذہن میں آیا۔ مفتی صاحب سوچتے ہوں گے کہ میں نے تو طفیل سے ایک ہی بار کچھ چھپوانا ہوگا۔ اسے روز میرے مضامین کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا خسارے کا سودا نہیں کرنا چاہیئے۔ یوں بات ختم ہو گئی۔ نہ میں نے رقم بتائی۔ نہ اُنہوں نے مسودہ بھیجا۔

اِدھر یہ اپنی نوکری پر بحال ہیں۔ اچھی خاصی گزراوقات ہو رہی ہے۔ اس لیے میں نے بھی اپنے "التفاتِ خسروانہ" کو واپس لے رکھا ہے۔ یعنی معاوضہ نہیں بھیجتا۔ اب یہ مجھے یاددہانی کا خط بھی نہیں لکھتے۔ معلوم ہوتا ہے۔ میری وہ سوچیں کچی تھیں۔ جن کی وجہ

سے دھیان میں آیا تھا کہ میں نے تو ایک ہی بار چھپوانا ہے اور اسے میرے افسانوں کی روز ضرورت ہوگی۔ یہ ان کی اصول پرستی ہے یا اَنا۔ کچھ خبر نہیں ہو پائی۔ بہر حال یہ انا پر لھلوٹ نہیں بلکہ عاجزی میں ہی اپنے قدم عرش پر سمجھتے ہیں۔ ہم اپنی جگہ خوش ہوں یا نہ ہوں۔ یہ اپنی جگہ ضرور خوش ہیں۔

یہ بات میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ مفتی صاحب کی جن سے دوستی ہے پکّی ہے۔ جن سے ناراضی ہے وہ بھی پکّی۔ انہوں نے نہ کبھی یوں قدم پیچھے ہٹایا۔ نہ ڈُوں قدم آگے بڑھایا۔ ایک وضع داری تعلقات کی استواری میں ہے۔ ایک وضعداری تعلقات کی کجی میں ہے۔ سچوں کی انجمن کے جیسے پختہ ممبر یہ ہیں۔ کم ہی کوئی ہوگا۔

میں نے ان سے ایک بار کہا "میں بہت نالائق ہوں۔ حقِ دوستی ادا کرنے میں کوتاہیوں کا مرتکب ہوتا رہتا ہوں۔ درگزر کیا کیجئے۔"

ان کا جواب تھا "بہت اچھا!"

اس بہت اچھا میں جو فہمائش تھی۔ اُس کی تپش سے تلملا اُٹھا۔ میں نے تنک کر کہا۔ "جی نہیں! میں آپ سے رعایت نہیں چاہتا۔ آپ مجھ سے جیسے کو تیسا والا معاملہ رکھیں۔"

ان کا پھر جواب یہ تھا "بہت اچھا!"

مَیں جو سائے میں بھی وزن و حجم کے متعلق سوچنے کا عادی ہوں۔ اُس وقت اتنا سٹپٹایا کہ طے نہ کر سکا کہ ان کے اس "بہت اچھا" کا کیا جواب دوں۔ سوائے اس راہِ فرار کے کہ انہیں اتنا پیٹوں، اتنا پیٹوں کہ چھٹی کا دُودھ یاد آجائے۔ مگر میں اپنے اس ارادے پر، بوجوہ عمل نہیں کر سکتا تھا۔ غالباً انہوں نے بھی میرے تیوروں سے، میری خاموش برہمی کا اندازہ کر لیا

ہوگا۔جبھی بہت دھیرے سے کہا "طفیل! تمہاری بہ ظاہر بے اعتنائی مبرا کچھ بھی، بگاڑ نہیں سکتی۔میں تو اُن احمقوں میں سے ہوں جو ایک بار جس چوکھٹ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر اُس چوکھٹ سے اُٹھ نہیں سکتے۔

میری طرح ان کی ایک بہت بڑی طرف دار بانو قدسیہ بھی ہیں۔اُن کا کہنا یہ ہے کہ ان میں اچھائیاں زیادہ ہیں۔ بُرائیاں اگر ہیں تو وہ اتنی معمولی کہ اُن پہ توجہ ٹکتی نہیں۔ان کے خیال کے مطابق لوگوں کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ ایک ٹولی دوستوں کی بنا لیتے ہیں اور ایک گروہ دشمنوں کا، تاکہ سامانِ عافیت کے ساتھ، سامانِ تگ و تاز کا بھی انتظام رہے۔انہیں ایسی باتیں، نہ تو سوجھتی ہیں اور نہ ہی انہیں نبھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔مطلب یہ کہ یہ کسی اسکیم کے ماتحت نہ تو کسی کو دوست بنا سکتے ہیں اور نہ دشمن! لیکن وقت پڑنے پر، یہ کام دشمنوں کے بھی آتے ہیں۔اگر کسی کے کام نہیں آتے تو صرف اپنے!

میں نے جب بہت کریدا تو بانو بہن نے کہا "اگر آپ کو مفتی صاحب کی برائیوں ہی سے دلچسپی ہے تو یہ سُن لیجئے۔خفا ہو جانا ان کی خاص الخاص عادت ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ بڑی بڑی باتوں کو معاف کر دیتے ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جاتے ہیں۔قطع تعلق کر لیتے ہیں۔خط لکھنا بند کر دیتے ہیں۔ملیں گے تو صورت سے معلوم ہو جائے گا کہ چٹخنے والے ہیں اور اگر کسی طور متنازعہ مسئلے پر گفتگو ہو جائے تو پھر انہیں رام ہوتے دیر بھی نہیں لگتی۔ایک دم موم ہو جاتے ہیں۔"

میں نے مفتی صاحب کے بارے میں ادھر اُدھر کی گپیں خود بھی ہانکیں۔ان کے دوستوں سے بھی کہا۔ارشاد! اس کے باوجود میں اس ٹوہ میں رہا کہ کوئی گھر کا بھیدی ملے

تاکہ وہ لنکا ڈھائے ۔ اس لیے کہ یہ کوئی باشندۂ آفاق تو ہیں نہیں ۔ میرے اور آپ ہی جیسے آدمی ہیں ۔ اس کے باوجود ان کی اُڑان اُونچی رہی ۔ اُونچی رہنے کے ساتھ ساتھ آڑی ترچھی بھی رہی ۔ ہم انہیں جتنا جتنا پکڑتے رہے اُتنا اُتنا اُونچے اُڑتے گئے ۔ جُل پہ جُل دیئے ۔ قصّہ مختصر، اس کھیل میں نہ وہ تھکے ۔ نہ ہم ہارے !

کرنا خُدا کا یہ ہوا کہ مجھے ان کی ایک عزیزہ مل گئیں ۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں ، میں نے جھٹ ان سے سوال کر دیا "کیا "علی پور کا ایلی" مفتی صاحب کی اپنی سوانح ہے ؟"

اُن کا جواب تھا "جی ہاں ! میں جب ۱۹۵۶ء میں میٹرک کا امتحان دیکر راولپنڈی گئی تو مفتی ماموں "علی پور کا ایلی" لکھ رہے تھے ۔ شام کو جب سب اکھٹے ہوتے تو اس کا بھی ذکر ہوتا کہ میں اپنی زندگی کی کہانی لکھ رہا ہوں ۔ مگر اُسے زندگی میں چھپواؤں گا نہیں ۔ مجھے اپنے خاندان کی کہانی پڑھنے کا اتنا شوق ہوا کہ مفتی ماموں کی عدم موجودگی میں ، کسی نہ کسی طرح مسودے کو پڑھتی رہی ۔"

لیجئے صاحب ! پہلے جو کھٹکا تھا کہ وہ کہانی ، ممکن ہے ان کی نہ ہو ۔ وہ جاتا رہا ۔ بات آئینہ ہو گئی ۔ دل کے نگر میں اُجالا ہو گیا ۔ میں نے پوچھا "اگر یہ سوانح مفتی صاحب کی ہے تو اس کے چھپ جانے پر ، خاندان میں خُوب ہنگامہ ہوا ہو گا ۔ اس لیے کہ اس میں بہت سی باتیں اخفا کی تھیں ۔ گھر کی انگنائی کی تھیں ۔ مگر وہ آگئیں سرِ صفحات !

"جی ہاں ! ہمارے خاندان کے ہر فرد کو شکوہ ہے کہ ممتاز نے "علی پور کا ایلی" لکھ کر خاندان کے ڈھکے چھپے راز طشت از بام کر دیئے ہیں ۔ شہزاد کی لڑکیوں کو اس کتاب سے خدا واسطے کا بیر ہے ۔ فرحت ایلی کی اکلوتی بہن شاکی ہے کہ ممتاز کو اپنے ابا کی کچھ تو عزّت

کرنی چاہیئے تھی ۔"

میں نے کہا " ماضی کی یاد جب لَو دینے لگتی ہے تو پھر جو کچھ بھی نظر آتا ہے وہ بہت اُجلا ہوتا ہے ۔ ایسے میں انسان پر بے خودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ پھر وہ اپنے بس میں نہیں ہوتا ۔ بلکہ وہ واقعات کے بس میں ہوتا ہے ۔ ایسے میں لکھنے والے کا انداز جارحانہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ زیادتی بھی کر سکتا ہے مگر جھوٹ نہیں بول سکتا ۔"

" میرے نزدیک بھی ممتاز ماموں کے کردار کی سب سے نمایاں اور سب سے بڑی خوبی، ان کا کھرا اور بے ریا انداز ہے ۔ وہ ہمیشہ سچی بات کہتے ہیں ۔ خواہ سُننے والے کو کتنی ہی کڑوی کیوں نہ لگے ۔ مفتی صاحب ! حج پر جانے لگے تو اُن کی والدہ نے کہا " ممتاز ! خانۂ کعبہ میں جا کر میرے لیے دُعا مانگنا " مفتی ماموں نے جواب دیا " اماں میری دُعا قبول ہُندی تے اپنے لئی نہ منگ لیندا ۔"

میں نے کہا " اس حد تک سچے آدمی کو تو خاندان میں کوئی بھی پسند نہ کرتا ہو گا ؟"

" یہ بات نہیں ۔ ہمارے گھر کا ہر فرد مفتی ماموں سے پیار کرتا ہے ۔ انہیں چھوٹے بڑوں کو اپنی گفتگو کے سحر سے مسحور کرنا آتا ہے ۔ جب وہ ملتان جاتے ہیں تو وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی کے مصداق سب اپنی زندگی کا معمول فراموش کر دیتے ہیں پھر لطیفے، قہقہے، فضا پر محیط ہوتے ہیں ۔ ہم موکل وہ عامل ہوتے ہیں ۔"

میں نے پُوچھا " اگر وہ روزمرہ کی زندگی میں اتنے پیارے ہیں تو وہ اپنی تحریر میں خوخیائے ہوئے کیوں نظر آتے ہیں ۔ کہیں اُن میں ماضی کی تلخ یادوں کی انتقامی حس تو بیدار نہیں ہو گئی ؟"

"میں اس ضمن میں یوں سوچتی ہوں کہ مفتی ماموں نے اپنے بچپن کی تلخیوں کو ضبط کر کے مسکرانے کا فن سیکھ لیا ہے۔ ان کے اندر حسرتوں کے معبد تعمیر ہوتے رہے اور وہ قہقہے لگاتے رہے۔"

میں نے کرید جاری رکھی "پہلے مفتی پر فرائیڈ کا غلبہ تھا۔ آج کل مذہب کا ہے۔ کینچلی کیسے بدلی؟ سینے کے دریچوں سے یہ ضو کیسے پھوٹی؟ یہ چھاتی کیسے شق ہوئی؟ کچھ اتا پتا بتایئے؟"

میں اس کی کوئی وجہ تو بیان نہیں کر سکتی مگر یہ جانتی ہوں کہ وہ مذہب کا ڈھونڈورا پرچار نہیں کرتے۔ وہ صحیح معنوں میں خدا کے عاشق ہیں۔ یہی عشق انہیں خانۂ کعبہ تک لے گیا۔ لوگ حج پر جاتے ہیں تو نہ جانے کتنی سوغاتیں لے کر آتے ہیں۔ مگر مفتی ماموں حج پر گئے تو اپنی ماں کے لیے تسبیح کے سوا کچھ نہ لائے۔"

میں نے محسوس کیا کہ شخصیت کا جادو غیروں پر نہیں اپنوں پہ بھی چل چکا ہے۔ بظاہر جو شخصیتیں بڑی نظر آتی ہیں وہ عموماً گھر میں اتنی ہی چھوٹی ہوتی ہیں۔ اس لیے میں نے پوچھا۔ "بچوں کے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہے؟ بیوی کے ساتھ برتاؤ کیسا ہے؟"

"میں بڑوں کے معاملات میں دخل دینا تو نہیں چاہتی مگر یہ ضرور کہوں گی کہ مفتی ماموں کو اپنے بیٹے عکسی سے عشق ہے اور عکسی صحیح معنوں میں عکسِ ممتاز ہے۔ ذہین، شوخ اور بے ریا۔ جب وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے چیکوسلواکیہ گیا تو مفتی ماموں کو چپ لگ گئی۔ عکسی کی تصویر دیکھ دیکھ کر روتے ہوئے مفتی ماموں کو پہلی بار دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ انہیں دل کا دورہ پڑا۔ چلنا پھرنا، کھانا پینا، ہنسنا بولنا سب کچھ ختم ہو گیا۔ چنانچہ اپنا تھیس چھوڑ کر

عکسی کو پاکستان آنا پڑا۔ ادھر عکسی نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا۔ اُدھر ممتاز کی بیماری نے پیچھا چھوڑا۔

"آخر عکسی کے علاوہ بھی تو بچّے ہیں؟

"جی ہاں مفتی ماموں، بہ طور باپ اپنے بچّوں کے باپ کم، دوست زیادہ ہیں۔انہوں نے کبھی روایتی باپ کا کردار ادا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بچّے صحت مند ماحول میں پلے بڑھے ہیں۔ ان کے اندر کسی قسم کا احساسِ کمتری نہیں۔ وہ بھی کھری اور سچّی باتیں کرنی جانتے ہیں۔ مفتی ماموں جن مصائب اور تلخیوں میں پلے، اُن کا شائبہ تک ان بچّوں کی زندگی میں نہیں۔"

میں نے کہا "کچھ اور بھی تو ان کی گھریلو نوعیت کی باتیں بتائیں؟ اس لیے کہ ہم اس باب میں نہ جاننے کے برابر معلومات رکھتے ہیں۔ کیونکہ اصلی آدمی تو گھر کے اندر ہوتا ہے۔ باہر ہم جس آدمی سے ملاقات کرتے ہیں وہ تو نقلی ہوتا ہے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔" آدمی تو آدمی ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ گھر کے اندر ہو چاہے گھر کے باہر ہو۔ پھر مفتی ماموں ایسے آدمی تو کھُلی کتاب ہیں۔ کوئی اسرار نہیں، کوئی راز نہیں۔"

"پھر بھی کچھ تو کہیئے۔ زیبِ داستان ہی کے لیے سہی!"

"زیبِ داستان کے لیے نہیں۔ واقعیت کے اظہار میں عرض یہ ہے کہ انہیں مکان بدلنے کا خبط ہے۔ بڑے مکان تبدیل کیے۔ کوئی مکان پسند نہیں آتا۔ کسی میں جگہ کم ہوتی ہے۔ کسی کا رُخ اچھا نہیں ہوتا۔ ایک مکان بدلنے کی وجہ پوچھی گئی تو جواب ملا۔" یار حقّہ رکھن لئی جگہ نئیں سی!" ۔۔ دوسرے مفتی ماموں نرم دل ہیں۔ شروع شروع میں جب

ایک بار، امتحانی پرچے جانچنے کے لیے آئے تو انھوں نے تمام لڑکوں کو پاس کر دیا۔ کوئی فیل نہ ہوا۔ اس پر ہیڈ ایگزمینر نے پرچے دوبارہ ان کے پاس بھیجے کہ ہاتھ سخت رکھیے۔ ان کا جواب یہ تھا۔ جب تک کوئی دل کا سخت نہ ہو۔ ہاتھ کا سخت نہیں ہو سکتا!"

میں نے کہا "مفتی نہ دل کے سخت ہیں۔ نہ ہاتھ کے سخت ہیں اور نہ ہی قلم کے سخت، تو پھر بات کیا بنی؟ وہ تو پھر میری طرح کے غلط آدمی نکلے۔"

"میں اس پر تو کوئی تبصرہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ اس میں آپ اپنے آپ کو بھی گھسیٹ لائے ہیں۔ بہر حال مفتی ماموں کسی رشتے کو نہیں مانتے۔ کسی بزرگانہ رتبے کو نہیں جانتے۔ وہ صرف دوستی کے قائل ہیں۔ مخلصانہ اور بے ریا دوستی کے!"

میرا خیال ہے کہ اب میں اِدھر اُدھر بھی جھانکوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان کے عزیزوں کے ذریعے ان سے واقفیت حاصل کرتے کرتے، کہیں رشتہ داریاں ہی ختم نہ کرا دیں۔ مفتی لاکھ فراخ دل سہی، پھر بھی جب یہ معلوم ہو کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جایا کرتے ہیں اور بڑی بڑی باتوں کو نظر انداز کر دیا کرتے ہیں تو مجھے دعا یہ کرنی چاہیئے کہ وہ ان چھوٹی باتوں کو بڑی باتیں ہی سمجھیں۔ ورنہ دل کے زخموں کو ٹانکا لگانا مشکل ہو جائے گا۔

مفتی صاحب نے مجھے ایک خط لکھا کہ مسرت پراچہ کو اس نمبر پر ٹیلی فون کرو۔ ساتھ ہی یہ لکھا کہ ٹیلی فون کرتے رہا کرو۔ میں نے حکم کی تعمیل نہ کی۔ گول کر گیا۔

مفتی صاحب نے دوسرے خط میں پوچھا "ٹیلی فون کیا تھا؟"

میں نے لکھا "میں نے اپنی عادت کے مطابق ٹیلی فون نہیں کیا۔ کیوں کہ میں عموماً خواتین کو خود سے ٹیلی فون نہیں کرتا۔ یہ عجیب بیہودہ سی بات ہے مگر ہے!"

اس پر مفتی صاحب چُپ ہو گئے۔ مگر ایک دن خود مسرّت پراچہ صاحبہ کا ٹیلی فون آیا۔ اُنہوں نے بتایا۔ "پچھلے دنوں مفتی صاحب آئے تھے مگر اُن دنوں آپ لاہور نہ تھے۔ انہوں نے ایک محفل میں مضمون پڑھا۔ آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔"

میں نے ملاقات نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کیا۔ بات ختم ہو گئی۔ پھر مفتی صاحب نے اپنا ایک مضمون مسرّت کو بھجوا دیا اور مجھے لکھا۔ "منگوا لینا۔"

میں نے سوچا۔ یہ مفتی صاحب ہماری مونچھیں ضرور نیچی کرائیں گے۔ چنانچہ میں دو چار دن تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو کے مصداق چپ رہا۔ ایک دن مسرّت کا ٹیلی فون آیا۔ "میں مفتی صاحب کا مضمون کہاں پہنچاؤں؟"

میں نے اپنے دفتر کا پتہ بتلا دیا۔ اس پر مسرّت نے پوچھا۔ "آپ کا دفتر گراؤنڈ فلور پر ہی ہے نا؟"

"جی!"

"یہ بات میں نے اس لیے پوچھی ہے کہ میں پہیّوں والی کرُسی استعمال کرتی ہوں۔"

"خیریت؟"

"بچپن ہی سے پولیو کے مرض میں مبتلا ہوں۔"

اس بات کا سُننا تھا کہ میں سناٹے میں آ گیا۔ اب مفتی صاحب کی وہ بات سمجھ میں آئی کہ ٹیلی فون کرو اور کرتے رہو۔ ان حالات میں، مجھے اس سے پہلے ٹیلی فون نہ کرنے پر افسوس ہوا۔ سینے سے دھواں سا اُٹھنے لگا۔

مفتی صاحب نے بتایا کہ "میرا مسرّت سے کوئی تعارف نہ تھا۔ ایک دفعہ رائٹرز گلڈ

والوں نے مجھے کتابوں کا جج بنا دیا۔ جتنی کتابیں وہاں پہنچیں۔ اُن میں مجھے مسرّت کا ناول پسند آیا۔ میں نے دوسرے ججوں کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا تو کسی نے بھی میری رائے کو قبول نہ کیا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ لڑکی چلنے پھرنے سے معذور ہے۔ اس لیے میں نے اُسے خط لکھا۔ "اگر میں فلم ساز ہوتا تو آپ کے ناول پر فلم بناتا۔ اگر میں امیر ہوتا تو آپ کو دولت میں تول دیتا۔ اگر میں نقّاد ہوتا تو آپ کے فن پر مضامین لکھتا۔ افسوس! کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

دورانِ ملاقات (اور مفتی صاحب کی موجودگی میں) مسرّت پراچہ نے کہا "طفیل صاحب! میرے پاس آپ کا ایک خط ہے۔ جو مجھے بڑا عزیز ہے۔"

"میرا خط؟"

"ہاں ہاں جناب کا!"

"جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے اس کے مطابق تو میں نے آپ کو کبھی کوئی خط نہیں لکھا۔ میں تو عموماً خواتین کے خطوں کے جواب گول کر جاتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ خواتین مجھے مغرور کہتی ہیں اور کچھ بدتمیز!"

"نہیں صاحب ہمارے پاس تو آپ کا خط ہے۔"

اتنا عرصہ مفتی صاحب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ بولے تو یہ! ہے تو کیا ہوا؟ الحمد شریف نہ پڑھی، طفیل کا خط پڑھ لیا۔ حرام ہے جو یہ جُبّہ و دستار اُتار کے بات کرے!

"اتنا بُجھا ہوا انسان ہوں کیا؟"

"اور کیا؟ ـــــ اچھا یہ بتاؤ۔ کبھی تم نے کسی خوبصورت لڑکی کو یہ لکھا ہے کہ تو"

خوبصورت ہے ؟ کبھی تم نے کسی خاتون کو لکھا ہے کہ دو چار دن میرے ہاں بھی آ کے قیام کرو۔"

بات خطرناک مرحلے میں داخل ہو چکی تھی ۔ اس لیے میں نے مسرت ہی کو مخاطب کر کے پوچھا " وہ خط میں نے آپ کو کب لکھا تھا اور اس میں کیا لکھا تھا ؟"

پھر مفتی صاحب گویا ہوئے " مسرت اسے جلدی جلدی سب کچھ بتا دو ۔ ورنہ اس کا انتقال ہو جائے گا ۔"

مسرت بھی میری گھبراہٹ سے محظوظ ہونے لگیں ۔ انہوں نے بتایا " وہ خط میرے نام نہیں ، کسی اور کے نام ہے ۔"

اب تو میں واقعی گھبرایا ۔ اور مجھے ایک مشہور ادیبہ کا وہ محبت نامہ یاد آگیا ۔ جو غلطی سے میرے نام کے لفافے میں مجھ تک پہنچا تھا ۔ میں نے بھی سوچا کہ نہ لکھنے پر بھی میں نے سینکڑوں ہی خواتین کو خط لکھے ہوں ۔ اچھے خط بھی لکھے ہوں گے اور بُرے بھی ۔ اچھے اُن معنوں میں نہیں جنہیں ممتاز مفتی اچھا کہتے ہیں ۔ بُرے اُن معنوں میں نہیں جنہیں مولانا مودودی بُرا سمجھتے ہوں ۔ جیسا موڈ ہوا ویسا خط لکھ دیا ۔ بُرا موڈ ہوا بُرا خط لکھ دیا ۔ نہ اچھا لکھنا میرے اچھا آدمی ہونے کی دلیل ہے ۔ نہ بُرا خط لکھنا میرے بُرا آدمی ہونے کا ثبوت ! بس اپنی طبیعت میں جو دھوپ چھاؤں قسم کی کیفیت پائی ہے ۔ وہ میرے ہر عمل سے ہویدا ہے ۔ یہی وجہ تھی کہ میں قدرے جز بز تو ہوا مگر معاملے کو ٹال دینا چاہا مگر مسرت ابھی اُسی سلسلے کو منقطع کرنا نہیں چاہتی تھیں ۔ انہوں نے کہا " بتا دوں کہ وہ خط کس کے نام ہے ؟"

" بتائیے !"

"راجہ مہدی علی خاں کے نام! میں نے انہیں ایک بار لکھا تھا کہ آپ مجھے کوئی اچھا سا تحفہ بھیجیں تو انہوں نے مجھے اس کے جواب میں، اپنے چند دوستوں کے خطوط بھیجے تھے۔ اُن میں ایک خط آپ کا بھی ہے۔"

میں نے کہا۔" الحمد للہ!"

مفتی نے کہا۔" دیکھا وہی احمد شریف والی بات!"

میں نے مفتی صاحب کی کئی خواتین سے گاڑھی چھنتی دیکھی ہے۔ وہ جن سے ملتے ہیں۔ بڑی بے تکلفی سے ملتے ہیں۔ باتیں مفتی صاحب کرتے ہیں لاج ہمیں آتی ہے۔ یہ مخملیں گفتگو نہیں کرتے، بلکہ کچھ برہنہ گفتاری ہی کی طرف راغب ہیں۔

ایک محفل میں، مفتی صاحب نے ایک خاتون سے پوچھا۔" سنا اَج کل تیرے یار دا کی حال اے"! آفرین اُس خاتون پر بھی، اُس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔" وہ آج کل ایک اور لڑکی میں دلچسپی لے رہے ہیں۔"

اسی طرح کسی اور موقع پر، میرے سامنے ایک خاتون نے کہا۔" آج کل میں اتنی ذکی الحس ہو گئی ہوں کہ بات بات پر رو دیتی ہوں۔ مفتی صاحب کا جواب یہ تھا۔" تیرا وی تے اوہو حال اے، روندی یاراں نوں اے لے نال بھراواں دے!"

مفتی صاحب خواتین سے ایسی ہی بے تکلفانہ باتیں کرتے ہیں۔ جیسی کہ ہم اپنے حد درجہ بے تکلّف دوستوں سے کرتے ہیں۔ کچھ رکھ رکھاؤ نہیں، کچھ شرم لحاظ نہیں۔ ٹن ٹن قسم کی گفتگو!

ایک دن کہنے لگے۔" یار اشفاق دا جھیڑا وڈّا پُتر اے او بڑا حرامدا اے!"

"حرامی سے کیا مراد ہے؟"

"وہ اتنا ذہین ہے کہ میرے بھی کان کترتا ہے۔"

یہ سارے انداز ان کے محبت کے ہیں۔ مردوں سے ملیں گے تو ان کے دوست بن کر، عورتوں سے ملیں گے تو اُن کی سہیلی بن کر، بچوں سے ملیں گے تو اُن کے یار بن کر، یہی وجہ ہے کہ یہ ہر عمر کے اور ہر صنف کے مقبول ترین اداکار ہیں۔ اداکار کا لفظ یہاں پہ فٹ نہیں ہو رہا مگر مجھے کوئی اور لفظ بھی نہیں مل رہا۔ بہر حال آپ ان کے خلوص پر کوئی شبہ نہ کریں۔

یہ عموماً ترنگ میں ہوتے ہیں۔ منہ بسورنا ان کے مذہب میں حرام ہے۔ متوجہ کرنے والی گفتگو کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر سب پہ چھا جانا ان کا حق، ایک دن چپکے سے کہہ دیا "یار ہپّی نمبر چھاپو!"

"ہپّی نمبر سے آپ کا مطلب؟"

"یہ جو آج کل لکھا جا رہا ہے۔ مادر پدر آزاد، پگڑی اچھال قسم کا!" ایسا نمبر!

"اگر کسی کو ہپیوں سے دلچسپی ہو تو وہ ہپّی نمبر چھاپے۔"

"کیا تم سمجھتے ہو۔ ان کا معاشرے میں کوئی رول نہیں۔ یہ لوگ جو ننگے پاؤں ملک ملک پھرتے ہیں۔ لکھ پتیوں کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ وہ اپنے اس اظہار سے دولت کے خلاف نفرت کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ جنسی اختلاط کو کوئی مسئلہ نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ روایتی اخلاق کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ وہ جو ہر وقت نشے میں دُھت رہتے ہیں تو وہ تصوّف کی منزلیں طے کرتے ہیں۔"

میں نے عرض کیا "اور جو چاہیں کہیں۔ اس ضمن میں تصوّف کو نہ لائیں۔ کیونکہ اس سے میرے جذبات مجروح ہوں گے۔"

"ہپّی ازم ہے کیا؟ وہ آپ ایسے ہی لوگوں کے خلاف تو ہے جو اخلاق کے ٹھیکیدار بنے پھرتے ہیں۔ جن کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔"

"بہت خوب!"

"یہ عالمگیر تحریک ہے۔ آج جو ہم بال لمبے کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی قلمیں رکھ رہے ہیں۔ اخلاق سوز حرکتیں کرتے ہیں۔ حفظِ مراتب کا خیال نہیں کرتے۔ کیا یہ ہپّی ازم نہیں؟"

"ہوا کرے میں کیا کروں؟"

اپنے آپ کو اس فضا میں ڈھالنے کی کوشش کرو۔ ورنہ تمہیں خودکشی کرنی پڑے گی۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے تم ایسے بزدلوں سے کوئی ہمدردی نہ ہوگی۔ کیوں کہ روایات کی ڈائیں بوسیدہ ہو چکی ہیں۔"

"اخوّہ!"

"سو بار کہو اخوّہ! بزدل ——!

یہ نہ صرف روزمرّہ کی زندگی میں عجیب ہیں بلکہ کھانے پینے کے سلسلے میں بھی عجیب ہیں۔ ایک دن میں نے سوچا کہ لوگ بلاوجہ ہی چائے پی پی کر اپنا ستیاناس کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کی آمد پر، خیال آیا۔ آج پھل منگوانا چاہئیں۔ ان کے سامنے میں نے پیسے دیئے۔ یہ خاموش رہے۔ ملازم انگور، سیب اور کیلے لے آیا۔ میں نے سامنے

رکھے اور کہا "کھایئے!"

"میں تو پھل کھاتا ہی نہیں!"

میں نے کہا "ان میں سے کوئی نہ کوئی پھل تو ایسا ہو گا جسے آپ پسند کرتے ہوں"۔

"قطعاً نہیں!"

"کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ پھل ایسی چیز ہے جو میرے اندر کے کڑواپن کو کم کر دے گی۔ اس لیے میں انہیں ہاتھ ہی لگانا نہیں چاہتا۔"

"کھا لیجئے۔ آپ اتنے کڑوے ہیں کہ اتنا سا پھل آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔"

"دشمن دشمن ہی ہوتا ہے۔ کم زیادہ یا چھوٹے بڑے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

ایک دن انہوں نے میری میز پر بہت سی ہومیوپیتھک دوائیاں پڑی دیکھیں۔ کہنے لگے ہومیوپیتھک کی تو کُل دو تین دوائیاں ہیں۔"

میں نے کہا "آپ ہر معاملے میں دخل نہ دیا کریں۔ آپ کو کیا معلوم، کل کتنی دوائیاں ہوتی ہیں۔"

"اچھا تُو بتا کتنی ہوتی ہیں؟"

"سینکڑوں ہوتی ہیں۔ بلکہ ایک ہی مرض کی درجنوں دوائیاں ہوتی ہیں۔"

"بالکل غلط! جو دوائیں آپ کے لیے مفید ہیں۔ دوائیں صرف اتنی ہوئیں۔ باقی دواؤں سے آپ کا کیا مطلب؟"

"سبحان اللہ! یہ کوئی شباب کے شانے ہلانے والا مسئلہ نہیں۔ جو آپ کو اُستاد

مان لوں!"

"زیادہ نہ بن! میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ایک دن پڑھتے پڑھتے احمد بشیر نے نعرہ لگایا تھا "مل گئی۔ مل گئی"۔ میں نے پوچھا۔ کون مل گئی؟ اُس نے بتایا تھا۔ ہومیوپیتھک دوا! اُس کتاب میں لکھا تھا "وہ شخص جو اکیلا رہنا چاہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی چاہے کہ ساتھ والے کمرے میں کوئی موجود بھی رہے"۔

میں نے کہا۔ چھوٹی چھوٹی علامتوں ہی پر دوا کا انحصار ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ عشق کی بھی دوا ہے۔ مثلاً جو عشق میں ٹھنڈی آہیں بھرے۔ اس کے لیے ایک دوا ہے۔ جو عشق میں سُبکیاں بھرے۔ اس کے لیے دوسری دوا ہے جو عشق میں روتا رہے۔ اس کے لیے تیسری دوا ہے"۔

"یار یہ تُو نے ایسی دوائیں بتائیں جو عشق کو بھگانے کے لیے ہوئیں۔ کوئی ایسی دوا بھی ہے جو عشق شروع کرا سکے۔ وہ دوا میں ایک لڑکی کو دینا چاہتا ہوں۔ وہ بالکل نکمّی ہے۔ عشق بھی نہیں کرتی"۔

ممتاز مفتی خطرناک حد تک سچے آدمی ہیں۔ مجھے کہتے ہیں تو بزدل ہے۔ تو کسی پر مضمون لکھتا ہے تو اس کے ساتھ رعایتیں کرتا ہے۔ زیادہ تر اس کی شرافت کے ڈنکے پیٹتا ہے۔ خباثتوں کے پردے چاک نہیں کرتا۔ تم ہمیں یہی بتاتے ہو کہ دیکھو، یہ شخص آدمی نہیں فرشتہ ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی الّو کا پٹھا کیوں نہ ہو"۔

"میں جس حد تک بھی جا کر لکھتا ہوں۔ اگر اُسی قدر ہی برداشت کر لیا جائے، تو بھی مت ہے"۔

"نہیں کھل کے لکھا کرو۔"

"اگر میں کھل کر لکھنے کی ابتداء آپ سے ہی کر دوں تو آئندہ آپ بھی مجھے دور سے سلام کریں گے۔"

"دور سے سلام نہیں کروں گا بلکہ سات سلام کروں گا۔ یہ دور ڈٹ کے بات کہنے کا ہے۔ یہ دور سچی بات کہنے کا ہے۔ یہ دور ملمعوں سے نفرت کا ہے۔ تم اپنے قلم کو ہتھیار بنا لو۔ بڑے بڑے تمہارے جوتے چاٹیں گے۔"

"مجھے یہ شوق نہیں کہ کسی سے ــ"

"میں ایک مضمون لکھنے والا ہوں۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ مگر اس کے کردار کا ایک رخ یہ ہے کہ وہ اپنی بچی کو کندھے پہ بٹھا کے، ایک افسر کے گھر گیا۔ اس سے جھوٹا رونا رویا۔ بڑھا ہو گیا ہوں۔ چند دنوں کا مہمان ہوں مگر میں سوچتا ہوں کہ اس بچی کا مستقبل کیا ہو گا؟"

"وہ افسر کہتا ہے" اللہ مالک ہے۔"

یہ شخص کہتا ہے "اس کے مستقبل کی فکر کرو۔ ورنہ یہ بڑی ہو کر چکلے میں بیٹھے گی۔"

اس پر میں نے کہا "ایسا حقیقت پسند تو میں نہیں بن سکتا۔"

"اور سنو وہی شخص اپنی بیوی کو پاس بٹھا کر یہ کہتا ہے کہ اُس کے ناجائز تعلقات فلاں شخص سے ہیں اور فلاں مرد سے بھی ہیں اور فلاں مرد سے بھی" اس پر اُس کی بیوی کسمسا کے کہتی ہے" دیکھئے یہ میرے بارے میں کیسی کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" اگر تم اُن پر مضمون لکھو تو کیا ایسی باتیں لکھ سکو گے؟"

میرا جواب تھا" نہیں! نہیں!!"

اس پر مجھے مفتی صاحب نے طعنہ دیا۔ "میں دس بارہ برس سے تمہیں بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ مگر آج تک تیرے اندر نہیں جھانک سکا۔ تُونے اپنے اُوپر شرافت کا ایک ایسا خول چڑھا رکھا ہے۔ جو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یار کبھی تو دستارِ فضیلت کو اتارو۔ کبھی تو کپڑے اُتار کے ملو!"

میں مندرجہ بالا سطور لکھنا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے لکھنا پڑیں۔ اس لیے کہ مفتی صاحب کی شخصیت کا یہ بے تکلفانہ رُخ اتنا نمایاں ہے کہ اگر میں ان کے اس پہلو کا اظہار نہ کرتا تو یہ اُداس ہو جاتے۔ کیفیتِ کرب طاری ہو جاتی!

ایک بار انھوں نے مجھے کہا۔ "میں ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ میری مدد کرو۔"

"بندہ حاضر ہے۔"

"میں ایک کوک شاستر لکھنا چاہتا ہوں۔"

"کوک شاستر؟"

"جی ہاں!"

"مجھے اس کتاب کے لکھنے کے سلسلے میں ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ جو عورت ہو۔"

"ایسا ساتھی تو خود ہی ڈھونڈے۔"

"مَیں کوک شاستر میں، زن و مرد کے تعلقات پر فلسفیانہ بحثیں کرنی نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ کتاب فعل کے عملی پہلوؤں سے متعلق ہوگی۔ دورانِ تحریر، اگر میں عورت کی نفسیات کو سمجھنے میں غلطی کروں تو وہ خاتون اس کی تصحیح کر دے۔"

"نیک خیال ہے۔ بسم اللہ کیجئے۔"

"غالباً جناب کا خیال یہ ہے کہ یہ کوئی بیہودہ کام ہے۔"

"جی نہیں، میرے نزدیک تو آپ نے اگر یہ کتاب، لکھ لی تو آپ کی عاقبت سنور جائیگی۔"

"بالکل عاقبت سنور جائے گی۔ اس لیے کہ ہم میں سے ننانوے فی صد مرد اور ننانوے ہی فی صد عورتیں، یہ نہیں جانتیں کہ اُس وقتِ خاص میں ایک دوسرے کو کس طرح سے خوش کیا جا سکتا ہے۔ اس کا علم حاصل ہونا چاہیئے۔ اس کا ادراک ہونا چاہیئے۔ یوں ہزاروں نہیں لاکھوں زندگیاں پُرمسرت زندگیاں گزاریں گی۔"

"کیا آپ کو ادراک ہے؟"

"دیکھو بھئی ہمارے والد صاحب اس فن کے امام تھے۔ میں نے تو جو کچھ پڑھا کتابوں میں پڑھا۔"

"دیکھ لی آپ کی بھی جرأت، ہمّت تھی تو اپنی بات کرتے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ سچ بولنا صرف پیغمبروں کا کام ہے۔ آپ جیسے اور مجھ ایسے آدمی تو پہلی ہی سیڑھی پر لڑھک جاتے ہیں۔ لہٰذا میں آپ سے اس موضوع پر کوئی بات کرنی نہیں چاہتا۔"

"نہ کرو!"

پچھلے دنوں ان پر مذہب اتنا سوار تھا کہ ہمہ وقت معرفت ہی کی باتیں کیا کرتے تھے آج کل دوسری طرف لڑھک گئے ہیں۔ آپ کی ذات بھی عجیب سا گورکھ دھندا ہے۔ میں تو سٹپٹا کے رہ گیا۔ گاہ مومن، گاہ کافر!

دیکھئے جی! مذہب کی بات اپنی جگہ پر، مگر میں اندھی تقلید کا قائل نہیں۔ ہر وقت

سبحان اللہ، سبحان اللہ کرنے والوں کو میں سچا مسلمان نہیں سمجھتا۔ بلکہ انہیں مسلمان سمجھتا ہوں۔ جن میں صحیح معنوں میں خوفِ خدا ہو۔ زبان اقرار نہ کرے بلکہ دل اقرار کرے۔"

"یہ تو صحیح ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں حج کرنے گیا تھا۔ میں حج کرنے اس لیے نہیں گیا تھا کہ ثواب ملے گا بلکہ اس لیے گیا تھا کہ مجھے رسولؐ کی ذات سے عقیدت ہے۔ مگر میں وہاں جا کر بڑا مایوس ہوا۔ عرب وہ عرب نہ تھے کہ جو تھے۔ میں تو پیٹ پر پتھر باندھنے والے کے دیس میں گیا تھا۔ مگر میں نے وہاں دیکھا کہ امارت پھٹی پڑ رہی ہے۔ کئی کئی منزلہ عمارتیں کھڑی ہیں۔ لمبی لمبی کاریں ہیں۔ شیوخ نے کئی کئی لونڈیاں ڈال رکھی ہیں۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے ہیں۔ اُن میں بلیو فلمیں چل رہی ہیں۔ خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہاں یہ کچھ ہو رہا ہے تو میں اپنے کملی والے سے شرمندہ ہو لیتا مگر وہاں نہ جاتا۔"

ان کی ہر بات انوکھی ہے۔ سوچنے کا اپنا زاویہ ہے۔ بات کہنے کا اپنا ڈھنگ ہے۔ پھر یہ ایسی تکلّم کی ڈگڈگی بجاتے ہیں کہ اِدھر اُدھر سے بے نیاز ہو کر ہر ایک کو ان کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خیالات کا طول و عرض نہ ملے۔ مثلاً "عورت کی ذات، بڑی چلتّر اور مرد کی ذات مظلوم!

میں نے کہا "آج تک یہی سُنا تھا کہ عورت کی ذات مظلوم ہے۔"

کہنے لگے "عورت بڑی چالاک ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک کر کے آٹھ دس بچّے مرد کی جھولی میں ڈال دیتی ہے۔ اس کے بعد کہتی ہے۔ اب انہیں پال، یہ چکّر ایسا ہوتا ہے جس سے مرد غریب مرتے مر جاتا ہے مگر اُس چکّر سے نہیں نکل پاتا۔"

"اچھا یہ بات ہے۔"

"ہاں یہی بات ہے۔ اگر کسی عورت کے ہاں اس چالاکی کی گنجائش نہیں ہوتی یعنی بانجھ ہوتی ہے تو وہ سینکڑوں ہزاروں روپے مرد غریب کے بغرض علاج خرچ کر ڈالتی ہے پیروں فقیروں کے پیچھے بھاگتی ہے۔ نذریں نیازیں دیتی ہے تاکہ کسی طرح ایک عدد آدمی کا بچّہ پیدا کرے تاکہ مرد کو بیوقوف بنا سکے۔"

"کیا مرد کو بچّے کی خواہش نہیں ہوتی۔"

"قطعاً نہیں۔"

"کیوں؟"

"عورت بیکار ہو جاتی ہے۔"

اب کوئی ان کی ایسی بے باکانہ باتوں کا کیا کرے۔ ذکر کرتے ہیں تو مارے جاتے ہیں۔ ذکر نہیں کرتے تو مفتی کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا۔ میں نے جو ایک ابتدائی قسم کا مضمون ان پہ لکھا تھا۔ اس میں جو کمی تھی وہ اسی نوع کے فرمودات کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دوستوں نے کہا "مفتی صاحب آپ کے قابو میں آنے والے نہ تھے۔" جن باتوں کو میں نے پہلے نظر انداز کیا تھا۔ اگر بہ سلسلہ مفتی وہی باتیں اہمیت رکھتی تھیں تو لیجئے وہ سقم تو دُور ہو گیا۔ باقی اسقام جواب بھی موجود ہوں۔ وہ میری حد تک مرضِ لاعلاج کے زمرے میں آئیں گے۔ بہر حال میرے نزدیک اب اس مضمون کی حیثیت یہ ہو گئی ہے جیسے مفتی صاحب مسجد سے نکل کر بازاری عورت کے کوٹھے پر جا سکتے ہوں۔

مَیں اوروں کی باتوں کو تو نظر انداز بھی کر سکتا تھا۔ خود مفتی صاحب نے مجھ سے

کہا۔ اس مضمون میں طفیلیّت کم ہے۔ اصل میں ضرورت مفتیّیت کی تھی۔ طفیلیّت کی نہ تھی۔ بہرحال اب جو میں نے مضمون کو مکمل کیا تو معلوم یہ ہوا کہ دونوں ہی، اسکیچ نویسی کے حمام میں ننگے ہو گئے۔ ایک شرحِ آدمیّت میں، دوسرا زدِ شرحِ آدمیّت میں، یعنی میری ذہنی کمائی ذرا بھی کام نہ آئی۔ دونوں ہی خود کشائی کے ہاتھوں لُٹ گئے۔

ایک بار مجھے کہنے لگے "میں نے سُنا ہے کہ تم فلاں فلاں آدمیوں سے، میرے بارے میں استفسارات کرتے رہتے ہو۔ وہ لوگ مجھے کیا جانیں۔ وہ لوگ تو خود کنویں کے مینڈک ہیں۔ مَیں انہیں کنویں کے باہر، اُچھال اُچھال کے پھینکتا ہوں۔ مگر وہ پھر پھُدک پھُدک کر کنویں میں آ گرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے میرے بارے میں کچھ نہ پوچھو!"

میں نے کہا "بہرحال وہ لوگ آپ کے دوست تو ہیں۔"

"آپ مجھے خود سے جتنا جانتے ہیں۔ وہی کافی ہے۔ مینڈکوں سے نہ کہو، نہ ملو!"

میرے خیال کے مطابق، انہوں نے جو دوستوں کے بارے میں، مینڈکوں کا لفظ استعمال کیا۔ وہ بہ طور استہزا نہیں بلکہ بہ طور تفنّن تھا۔ پچھلے دنوں تک میں نے ان سے تعلّی کی بات کبھی نہیں سُنی تھی۔ آج کل یہ خبط بھی ہے۔ زندگی بھر ان کے ذہن نے قلابازیاں کھائی ہیں۔ پہلے کچھ تھے۔ بیچ میں کچھ تھے۔ اب کچھ اور بن رہے ہیں۔ ذہنی عمارت تو وہی ہے مگر سامان ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھتے رہتے ہیں۔ شخصیت کے تار و پود جامد نہیں متحرک ہیں۔ مگر شخصیت کا وہ بنیادی جوہر، جس کی بنا پر انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ وہ اپنی جگہ برقرار رہا ہے اور برقرار ہے۔ سچ مفتی صاحب بڑے پیارے ہیں۔ ان سے ہر ملاقات پر، مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے پہلے کوئی کمی تھی جواب پوری

ہوگئی ہو ۔

بینڈ کوں سے نہ ملو کے جواب میں، میں نے کہہ دیا ” بہت اچھا “

” واقعی ان سے ملنا، تمہارے لیے ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کپڑے والے کی دکان پر جاکر، اُس سے گُڑ مانگو “

میں نے کہا ” بہت اچھا جناب! اب میں کریانہ اور بزاز کی دکانوں پر، وہی کچھ لینے جاؤں گا۔ جو کچھ کہ وہاں ملتا ہے “ اس کے ساتھ میں نے ان سے یہ پوچھا ” آپ ایسے نثر نگاروں کو کچھ دلچسپی، شاعری سے بھی ہوتی ہے ؟ “

” ہوتی ہے “

” اس وقت دل چاہتا ہے کہ آپ کوئی اچھا سا شعر سنائیں تاکہ دل جھلملا اُٹھے ۔

” نہ صرف اچھا بلکہ ایسا، جس کا جواب اُردو شاعری میں بھی نہیں “

” کیا کوئی فارسی کا شعر ؟ “

” ارے نہیں پنجابی! سنو ؎

جُھٹیا وے اک جُھوٹھ ہور بول جا

کوئی نواں لارا لا کے مینوں رول جا

طفیل تمہیں چاہیئے کہ ایک عدد لوک گیت نمبر بھی چھاپو! “

” پنجابی کے لوک گیت ؟ “

” نہیں ساری زبانوں کے، یعنی پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی کے! اُردو میں تو تھوڑا بہت کام ہوا بھی ہے لیکن دیگر زبانوں میں نہیں ہوا “

مجھے یہ ساری زبانیں تو آتی نہیں۔ اگر میں نے اس نوع کی کوشش کی تو گھپلا ضرور ہوگا خواہ مخواہ مارا جاؤں گا۔ ایسے کام میرے لیے ماتھے کا ٹیکا نہیں بن سکیں گے۔

"میں اسے نہیں مانتا۔ اُردو تیری اکتسابی زبان ہے۔ اس میں تو نے سب کا پڑا کر دیا۔ اس لیے تُو دیگر زبانوں میں بھی دوستوں کی مدد سے سب ہی کچھ کرلے گا۔"

"جن کاموں کا میں نے ڈول ڈال رکھا ہے۔ پہلے اُنہیں تو ہو جانے دیجئے۔ کیوں مجھے مزید خون تھوکنے پر مجبور کر رہے ہیں؟"

"ارے ظالم سُن اک گدّے دے بول:

ککراں وی لنگ آئی

ٹالیاں وی لنگ آئی

تُوتاں ہیٹھوں لنگ آئی وے

مرغابی وانگوں تَردی

تیرے پسند نہ آئی وے

اگر کوئی ان سے حال پوچھے تو کہتے ہیں کہ اس عمر میں پہنچ کے، کچھ حال باقی نہیں رہتا۔ جی رہے تو غنیمت! نہ جیئں تو عمر کا تقاضا!

"اتنے مایوس کیوں ہیں؟"

"مایوس نہیں۔ بس یہ جانتا ہوں۔ موت گلے ملنے آ رہی ہے۔ مجھے اس کے استقبال کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے۔"

پاس بیٹھنے والے نے کہا "مفتی صاحب دنیا بڑی خوبصورت ہے۔ مایوسی کی

باتیں نہ کیجئے ۔ کل میں آپ کو سن رائز کا منظر دکھاؤں گا ۔ آپ کو پھر سے زندگی سے محبت ہو جائے گی ۔"

"میری عمر تو سن سیٹ دیکھنے کی ہے ۔"

القصّہ ! ممتاز مفتی ایک ایسا شخص ہے جو دوستی کے آنگن میں بہت دھیرے دھیرے نقب لگاتا ہے ۔ کبھی خلوص کی کدالوں سے ، کبھی محبّت کی چھینیوں سے اور یہ کام وہ اتنے فن کارانہ انداز میں انجام دیتا ہے کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی ۔ انجام کار بے دام بک جانا پڑتا ہے ۔



خدیجہ مستور

میں جب بھی کسی خاتون پر لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو ذہن میں چھن، چھن کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور مَیں قلم رکھ کر آوازیں سُننے میں محو ہو جاتا ہوں۔ یوں میرے مضمون اُدھورے رہ جاتے ہیں۔ خُدا کرے اس مضمون کے سلسلے میں، میری بے بسی مجھ سے دُور رہے۔

خدیجہ مستور سے میں اتنی بار ملا ہوں کہ اُتنی بار اپنے کسی دشمن سے بھی نہیں ملا۔ کیونکہ فی زمانہ روش اور رسم یہ ہے کہ لوگ دشمنوں سے ڈرتے ہیں اور دوستوں سے کتراتے ہیں۔ یوں دوستوں میں سے دوستی کا بھرم جاتا رہا لیکن دشمنوں کے سینوں سے کینہ نہ گیا۔ ثبات بھی ملا تو کیسے؟ جیسا دَور ویسا انعام!

اللہ کا شکر ہے کہ مجھے نسیان کا عارضہ ہے۔ اگر مجھ میں یہ اتفاقیہ خُوبی نہ ہوتی تو آج آپ کو مجھ سے مضمون نہیں پوری کتاب سُننی پڑتی۔ یہ وہی وصف ایک اعتبار سے خوش آئند

بھی ہے کہ انسان اچھی باتوں کے ساتھ بُری باتوں کو بھی بھول جاتا ہے۔ اس لیے آپ بھی میری ان یادوں کو تو سے پہ بوند ہی سمجھیں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ سے جلدی سے ایک بات کہدوں تاکہ اس کے بعد معاملہ قابو میں آسکے اور وہ یہ کہ میرے نزدیک خدیجہ مستور مساوی ہیں ایک علےٰ دہن کے، جو اچھی بھی ہیں۔ بُری بھی، اچھی اِن معنوں میں کہ انہیں سب اچھا کہتے ہیں۔ بُری اس پاداش میں کہ انہوں نے آج تک میرے ساتھ بھی زیادتی نہیں کی۔ جب کہ اپنے اِس حق کو تقریباً سارے ہی چھوٹے بڑے ادیبوں نے استعمال کر ڈالا ہو۔

اگر آپ نے میری باتوں سے تاثر یہ لیا ہو کہ میں انہیں معصوم عن الخطا ثابت کرنے لگا ہوں تو آپ اپنی اِس غلط فہمی کو ابھی سے غسل کرا دیں۔ اس لیے کہ میں نے کبھی بھی انسانوں کو فرشتہ نہیں بنایا۔ یعنی میں نے ایک بار بھی انسانیت کی توہین نہیں کی۔

یہ بات ۱۹۴۴ء کی ہے یا ۱۹۴۵ء کی کہ میں لکھنؤ کے جھوائی ٹولہ میں ان کے ہاں جانکلا۔ اُس ایک مکان میں دو افسانہ نگار خواتین رہتی تھیں۔ اُن میں سے ایک کا نام ہاجرہ مسرور اور دوسری کا نام خدیجہ مستور سمجھ لیجئے۔ اتفاق کہ دونوں آپس میں بہنیں نکلیں۔ یہی اتفاق نقّادوں کے بھی کام آگیا۔ ایک پہ مضمون لکھا۔ دوسری خود بخود زد میں آگئیں۔

قصّہ کوتاہ، میں ان کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا تھا اور یہ ڈرائینگ روم سے باہر تھیں۔ گفتگو اور محویانِ گفتگو کا وہ انداز آج عجیب سا لگے گا مگر اُس دَور میں عجیب نہ تھا۔ بہر حال میں پریشان ضرور ہوا کہ کیوں بغیر ٹوہ کے ان بیبیوں کے ہاں آن نکلا۔ مگر اُس وقت کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ میں باہر نکل سکتا تھا اور نہ یہ اندر آسکتی تھیں۔

پھر پاکستان بن گیا۔ چھریوں کے غسل میں بھی مسلمان پاکستان آنے لگے۔ یہ سمجھ کر کہ آنکھوں پہ پلکوں کا بوجھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک دن، ان بہنوں میں ایک یعنی محترمہ ہاجرہ مسرور ہمارے دفتر تشریف لائیں۔ آواز آئی "میں طفیل صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔"

میں جو اپنی روایتی بزدلی کی وجہ سے، پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے مرض میں مبتلا ہوں۔ اُس وقت کیوں نہ چوکس ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے آپ کو ایک دم کسی خاتون کی خدمت میں پیش کر دینا مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے احتیاط کی ڈوری لڑھکا دی۔ "آپ کو اُن سے کیا کام ہے؟"

اُنھوں نے نستعلیق سے لہجہ میں لیکن کچھ کچھ ڈانٹ کے سے تیوروں کے ساتھ کہا۔

"آپ کو اس سے کیا؟"

لیجئے مجھی کو یہ سمجھایا جارہا تھا کہ طفیل کو طفیل صاحب سے کیا غرض، یہی وجہ تھی کہ جب میں نے اپنے ہی حقوق پامال ہوتے دیکھے تو قدرے سنبھل اور سہم کر پوچھا "کیا آپ طفیل صاحب کو جانتی ہیں؟"

فرمایا "لاحول ولاقوۃ!"

اس جواب پر صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھی سے ملنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ میں نے بھی بے جھجک عرض کر دیا۔ "بندہ زادہ ہی کو محمد طفیل کہتے ہیں۔"

"اچھا! اچھا!!"

"جی!"

"میں ہاجرہ مسرور ہوں۔"

ماں جان اور نام سُن کر بھوچکا سا ہو کر رہ گیا۔ خفا ہونے کا موقع، نام سُنتے ہی ہاتھ سے نکل گیا۔ کیوں کہ یہاں بھی تو قصّہ یہ ہے کہ نام بڑا اور درشن تھوڑے! اصل میں یہ سارا چکّر پردے اور برقعے کا تھا۔ پھر میری بلا وجہ پر چول کا، نہ انہوں نے مجھے دیکھا تھا نہ مَیں نے اُنہیں، یہی وجہ تھی کہ جانبین کو ششدر رہ جانے کا ایک عدد سنہری موقع مل گیا تھا۔

مضمون تو مجھے پڑھنا ہے خدیجہ مستور پر، ذکر نکل آیا ہاجرہ مسرور کا، خطا معلوم، آپ بھی سوچ رہے ہوں گے۔ بہک گیا ہوں۔ جی نہیں، قِصّہ یہ ہے کہ جب تک یہ دونوں ایک دوسری کو اپنی بہنیں سمجھتی رہیں گی۔ یہ گھپلا ضرور ہوگا۔ اس لیے کہ یہ دونوں بہنیں ایک دوسری کی تفسیر ہیں۔ قلمی طور پر بھی ایک کو دوسری سے جُدا کرنا مشکل ہے۔ کوئی بے رحم ہی بن جائے تو وہ مسئلہ الگ ہے۔ بالکل ایک کو چھپائیں، دوسری کو دکھائیں والا مسئلہ ہے۔ غرض یہ دونوں بہنیں ناگزیر حد تک بلکہ ناگزیر کی بھی آخری حد تک ایک دوسری کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جب بھی دونوں کو اکٹھا دیکھا۔ ایک کو دوسری کے پکھوے سے لگا ہی دیکھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ فلکِ کج رفتار سے ان کی ایسی پیوستگی دیکھی نہ گئی، دُوری کا فرشتہ درمیان آکے کھڑا ہو گیا۔ ہاجرہ کو کراچی پہنچا دیا۔ اب یہ لاہور میں رہ کر اُن کی سلامتی اور واپسی کے لیے دعائیں مانگا کرتی ہیں۔

میں نے برونٹی سسٹرز (BRONTE SISTERS) کی قبروں پہ بھی جا کر اُن سے پُوچھا تھا کہ بتاؤ نیک بختو، تم بہنوں میں زیادہ محبّت تھی یا ہمارے ہاں کی "خدیجہ سسٹرز" میں، تو کوئی جواب نہیں ملا تھا اور میں جان گیا تھا "الخموشی نیم اقرار"۔

اتنی یگانگی اور اتنی مطابقتوں کے باوجود یہ دونوں (ہاجرہ اور خدیجہ) اپنی اپنی جگہ پہ، روشنی کے میناروں کی طرح الگ الگ بھی کھڑی ہیں۔ فن کے اعتبار سے شخصیتوں کے اعتبار سے بے شک کوائف یکساں ہیں۔ برتاؤ یکساں نہیں۔ بس اب یہاں سے اس بندۂ ناچیز کے لیے گریز لازم ہے۔ ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے کیوں کہ مجھے تو دونوں بہنوں میں سے ایک برونٹی پر مضمون لکھنا ہے۔

برونٹی سسٹرز سے یاد آیا کہ وہ تین بہنیں تھیں۔ تینوں لکھتی تھیں۔ یہ بہنیں تو زیادہ ہیں مگر لکھتی تین ہیں۔ یعنی ان میں ایک عائشہ جمال کا بھی اضافہ کر لیجئے۔ عائشہ نے نہ صرف متعدد افسانے لکھے بلکہ عرصہ ہوا ان کا ایک ناول بھی چھپا تھا اور یہ، دونوں زیادہ مشہور افسانہ نگاروں سے بڑی ہیں۔ ان کی ایک اپنی دلآویز سی شخصیت ہے۔ اِن کا ذکر پھر کبھی سہی، کیونکہ ابھی تو مجھے وہی غم کھائے جا رہا ہے کہ کس طرح خدیجہ کے ذکر سے ہاجرہ کے ذکر کو خارج کر دوں۔

شادی سب کی ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی بھی ہو گئی۔ یعنی خدیجہ بہن کی، شادی ہوئے ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ عید آدھمکی۔ عید ملنے کے لیے نہیں بلکہ وقت گزارنے کے لیے، میں ان کے ہاں بھی جا نکلا۔ عید اوروں کے لیے خوشی کا دن ہو گا میرے لیے نہیں۔ اس کی کچھ وجوہ ہیں۔ جن کا ذکر اس محفلِ دید میں مناسب نہیں۔

معانقے اور خیر خیریت کے تبادلے کے بعد، توصیف نے کہا "اُوپر والے کمرے میں گھر کے افراد جمع ہیں مگر آپ کو بلایا خدیجہ بہن نے ہے۔

بیٹھے بٹھائے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ سوچ میں پڑ گیا کہ پردے کے پیچھے سے باتیں ہوں گی۔ پھر بندہ کو مہاتما بُدھ بنایا جائے گا۔ چنانچہ میں نے توصیف کو پٹی

پڑھانے کے سے انداز میں کہا "جانِ برادر! میرا سلام عرض کر دیں اور یہ بتلا دیں کہ وہ بہت مزے میں بیٹھا ہوا ہے۔"

"ارے نہیں، خدیجہ بہن تو مٹھائی سامنے رکھے بیٹھی ہیں اور جناب نخرے فرمانے لگ گئے ہیں۔"

"یار وہ پردہ؟"

"ارے بھئی اٹھو بھی، آج بہن بھائی سے پردہ نہیں کرے گی۔"

وہ چھوٹی عید تھی۔ ہماری بڑی عید ہو گئی۔ اگر چھوٹی عید اور بڑی عید کے چکر میں مفہوم غلط پڑ رہا ہو۔ یعنی سوّیوں میں گوشت کی خوشبو شامل ہو رہی ہو تو یہ جان لیجئے۔ ایک عید میں دو عیدیں ہو گئیں۔ اُس وقت میں بالکل ننّھا تھا۔ یعنی قبل ازیں سوچوں کی دولت بھی ساتھ نہ تھی کہ ایسی افراتفری کی ملاقات میں یہ یہ کچھ پوچھوں گا۔ یہ یہ کچھ کہوں گا اور یہ یہ خوبصورت فقرے اپنی گفتگو میں سجا کر باتیں کروں گا۔ اچھی گفتگو کرنے والوں میں عموماً یہ خوبی دیکھی کہ وہ چند رٹے ہوئے جملوں سے اپنے ملنے والوں پہ حملہ آور ہوتے اور انہیں زیر کرتے ہیں اور انہیں یہ خبر نہیں ہوتی کہ یہ غریب تو ان جملوں کو پہلے بھی سہار چکا ہے۔ کچھ ایسے ہی دُبدھے کے عالم میں میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے خلوص نامی ہتھیار سے حملہ کر دیا۔ پھر اس شغل سے انہوں نے آج تک ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ ان کے بے پایاں خلوص تلے اتنا دبا ہوا ہوں کہ پھر سر نہ اُٹھا سکا۔ ہر موڑ پر عناں گیر اور ہر قدم پر ہم سفیر پایا۔

یہ تعلقات کو زیادہ دیر تک کیسے نبھاتی ہیں۔ یعنی دُور تک کیسے ساتھ دیتی ہیں۔

وہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اگر آپ ان کے حلقۂ ارادت مندوں میں ہیں تو آپ کی آدھی عمران کی خدمت میں پیشیاں بھگتتے گزر جائے گی۔ چلو نصف زندگی کا مسئلہ تو حل ہو گیا باقی رہا نصف زندگی کا مسئلہ، تو وہ جمہوریت حاصل کرتے کرتے حل ہو جائے گا۔ ہاں تو پہلی نصف زندگی گزارنے کا یہ ہے کہ انہیں آپ سے ذرا سی بھی شکایت ہو گی تو اُسے فوراً زبانِ شیریں بیان پر لے آئیں گی۔ تم رُوٹھے ہم چھُوٹے کی نوبت نہیں آنے دیں گی۔ اگر آپ کا قصور ہے تو معافی مانگیے۔ قصور نہیں تو ثابت کیجئے۔ غرض شبہ کی رعایت ان کے ہاں نہیں دی جا سکتی۔ یہ خود کہتی ہیں۔ اگر میں شکایتوں کو دل میں جگہ دینے لگوں تو پھر میرے اپنے پاس کچھ نہیں رہ جاتا۔

انسانی ہمدردی کا جذبہ ان میں بدرجہ غایت موجود ہے۔ اس درجہ کہ زندگی کا قرینہ بن گیا اور یہ حقیقت ان کے افسانوں میں بھی بکھری پڑی ہے۔ ہر لفظ میں، ہر سطر میں، یہ ہمارے راہ نماؤں کی سی خُو بُو نہیں رکھتیں۔ یعنی ہوں کچھ فرمائیں کچھ، چُپ رہیں تو آدمی لگیں، بولیں تو آدمی بھی نہ رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے افسانوں کو اور ان کی زندگی کو نقل مطابق اصل سمجھتا ہوں۔ ان کے افسانوں کی پہچان اور ان کی پہچان میں خُون اور روشنائی کا فرق ہے۔ کبھی کبھی تو یہ فرق بھی مٹ جاتا ہے۔ خون ہی سے لکھ ڈالتی ہیں۔

نصیبِ دشمناں، ایک بار ان کے چھوٹے بھائی کے گلے کا آپریشن ہوا۔ وہ زمانہ شدید گرمیوں کا تھا۔ بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینے والا، اُدھر ہسپتالوں میں جگہ نہیں۔ ایک انار صد بیمار والا معاملہ، شاید اسی لیے خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے وارڈوں کے

ساتھ برآمدوں میں بھی چارپائیاں ڈال کے مریضوں کو ٹھونس ٹھونس دیا جاتا ہے۔

انہوں نے بھائی کے پاس جاتے ہوئے دیکھا کہ ایک ستر اسّی سال کا بوڑھا، ہڈیوں کا ڈھانچہ، زندگی اور گرمی سے عاجز۔ آنکھوں کے آپریشن سے نڈھال پڑا کراہ رہا ہے۔ تڑپ تڑپ اُٹھتا ہے۔ بے بس و بے یار و مددگار ہے۔ بوڑھے کا حال ان سے دیکھا نہ گیا۔ بھائی کی تکلیف کو بھول کر یہ اپنی ملک میں بوڑھے کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ ہمدردانہ اور اپنایت لہجہ میں حال پوچھا۔ پاس جو دستی پنکھا پڑا ہُوا تھا۔ اُسے اُٹھا کر جھلنے لگ گئیں۔ بوڑھے کی آنکھوں پہ پٹیاں بندھی تھیں، دیکھ نہ سکا کہ یہ کون ہیں، اُدھر چلنے پھرنے والے آنکھوں والے اندھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کسی کو بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ بوڑھے نے پوچھ ہی لیا "آپ کون ہیں، کہاں سے آئی ہیں؟"

انہوں نے جھٹ بات بنائی تاکہ بوڑھا احساسِ کمتری کا شکار ہو کر پریشان نہ ہو جائے۔ "بابا مَیں غریب عورت ہوں۔ یہاں قریب ہی جھگیوں میں رہتی ہوں"۔ بعض اوقات جھُوٹ بولنا بھی اتنا ہی ضروری ہوتا ہے جتنا کہ سچ بولنا۔

بوڑھے نے کہا "آپ نے ایک بے بس اور لاچار انسان کے حال پر بڑا کرم کیا"۔

انہوں نے جواب دیا "حال ہی تو پوچھا ہے، پنکھا ہی تو جھلا ہے"۔ اور یہ پنکھا جھلنے کا سلسلہ اُس دن تک جاری رہا۔ جب تک کہ توصیف ہسپتال سے واپس نہ آ گئے۔ یوں بوڑھا بھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں سو جاتا ہوگا۔ یوں انسانیت کے ماتھے کی بندیا بھی چمک اُٹھتی ہوگی۔

یہ بے حد کاہل ہیں۔ امام الکاہلا کہیں تو بھی ان کی کوئی خاص حوصلہ افزائی نہ

ہو گی ۔ سارا دن آپ گھر میں ایسی ہی آوازیں سنیں گے ۔ کرن یہ دے جاؤ ۔ پرویز وہ اُٹھا لاؤ ۔ اگر موسم سردیوں کا ہو تو پھر ان کا کئی کئی دن تک لحاف میں پڑے رہنا بھی قطعاً تعجب خیز نہ ہوگا ۔ اُن دِنوں سُو سُو کرنا اور سی سی کر کے چائے پینا ہی ان کے محبوب مشغلے ہوتے ہیں ۔ غرض لحاف چھوڑنے کو حتی الامکان راضی نہیں ہوتیں ۔ خواہ کتنے ہی ضروری کام اٹک اور لٹک جائیں ۔ سُنا ہے اِن دنوں یہ شوق کچھ رُو بہ تنزّل ہے ، جانے کس کی نظر لگ گئی ۔

انہیں دوسروں کی سرپرستی فرمانے کا شوق کچھ وافر ہی ملا ہے ۔ چھوٹوں کی سب سرپرستی فرماتے ہیں ۔ یہ بزرگوں کی سرپرستی فرماتی ہیں ۔ سرپرستی ان معنوں میں کہ ان کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہیں ۔ معاملات کی اُونچ نیچ سمجھاتی ہیں ۔ مشورے دیتی ہیں ۔ ڈراتی دھمکاتی ہیں ۔ اسی کارن میں نے ایک بار یہ دیکھا کہ یہ بزرگ سفید ریش کو سمجھا رہی تھیں ۔ یوں نہیں یوں ، ویسے نہیں ایسے ، اُس واقعۂ عبرت کے بعد ، میں ان کی ہر بات چپکے سے اور بلا چون وچرا مان لیتا ہوں ۔ ورنہ اس سے پہلے تک میں اپنے آپ کو اتنا نا سمجھ نہیں سمجھتا تھا ۔

بچّے ان سے بڑا پیار کرتے ہیں یا یہ کہ یہ بچّوں سے پیار کرتی ہیں ۔ جہاں یہ ہوں وہاں بچّے اپنی ماؤں کو بھول جاتے ہیں ۔ بالکل ویسے ہی جیسے رشتہ دار ، اپنے رشتہ داروں کو بھول جایا کرتے ہیں ، معلوم نہیں یہ بچّوں کی زبان میں کیسی مٹھار مٹھار کے باتیں کرتی ہیں کہ وہ انہی کا کلمہ پڑھنے لگ جاتے ہیں ۔ وہ انہی کے ساتھ رہنے یا گھر جانے کو تیار ہو جاتے ہیں ۔ ضرور کسی نہ کسی ترکیب سے یہ خود بچّہ بن جاتی ہوں گی ۔ ورنہ بچّے کیوں انہیں اپنی برادری میں سے سمجھتے ۔

چھ ستمبر کا دن ہمارے ہاں ایک قومی دن کے طور پر منایا جانے لگا ہے۔ قربانیوں کا کچھ تو انعام ملا۔ سہاگوں کے لٹنے کا کچھ تو مداوا ہوا۔ خدا اعلانِ تاشقند کرنے اور کرانے والوں کو خوش رکھے۔ اُس دن کھیل تماشے ہوتے ہیں۔ میلہ لگتا ہے۔ تمغے بٹتے ہیں۔ ایک ایسی ہی تقریب میں، جس میں تمغے بٹ رہے تھے۔ یعنی جہاں شہیدوں کے خُون کو واہگہ، کھیم کرن، جوڑیاں اور منا بھاؤ کی سرحدوں سے اٹھا کر تاشقند کی گلیوں میں اُچھالا جا رہا تھا۔ وہاں یہ بھی موجود تھیں۔ جب ایک خاتون کو تمغہ دیا گیا تو وہ رونے لگ گئیں۔ اِدھر یہ بھی رونے لگ گئیں۔ خاتون تو ذرا کی ذرا روئیں۔ یہ مسلسل روتی رہیں۔ آس پاس والوں نے سمجھا کہ شہید اِن کا کوئی قریبی عزیز ہوگا۔ یہ نہیں رو رہیں بلکہ ان کا خُون رو رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے سمجھایا۔ بہن صبر کیجئے۔ یہ رونے کا نہیں شکر کا مقام ہے۔

جب ظہیر بابر نے یہ نقشہ دیکھا تو بیوی کو وہاں سے اُچک لائے۔ ایک صاحب جو اُنہیں یوں ہلکان ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ہی اُٹھے۔ پوچھا "بہن! جو شہید ہوئے ہیں۔ وہ آپ کے کیا لگتے تھے؟"

[کپکپاتی آواز] وہ میرے کچھ نہیں لگتے تھے، وہ میرے سب کچھ لگتے تھے"۔ انسانی زندگی کے مرحلے بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ کبھی منٹ میں رشتہ چھوٹ جاتا ہے۔ کبھی منٹ میں رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔

کچھ لوگ محاورے کے مطابق مُنہ پھٹ ہوتے ہیں۔ کچھ بے محاورہ زبان پھٹ ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق پہلی برادری سے نہیں۔ دوسری برادری سے ہے۔ میرے نزدیک منہ پھٹ وہ ہوتے ہیں جو بڑی بڑی باتیں، سوچے بغیر پڑاخ سے کہنے کے

عادی ہوں۔ انجام جو بھی ہو۔ زبان پھٹ وہ ہوتے ہیں۔ جو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی سوچ کر کرتے ہوں مگر گھاؤ کاری لگاتے ہوں۔ یعنی چٹکیہ تیور ہیں ذہانت ہو۔ بلیدی نہ ہو کاٹے کا منتر مفقود نہیں موجود ہو۔

اتفاق کی بات کہ یہ مرغی کا گوشت نہیں کھاتیں۔ نہ جانے کیوں؟ نہ جانے کیوں والی بات میرے علم کی حد تک ہے۔ ورنہ انہیں تو معلوم ہوگا۔ جو بات کوئی خود بتا دے میں سُن لیتا ہوں۔ جو بات کوئی خود نہ بتائے وہ میں نہیں پوچھتا۔ یعنی کرید کاری اپنا پیشہ نہیں۔ اگر اپنا پیشہ یہ بھی ہوتا تو میرے ساتھ وہ بھی ہو چکا ہوتا جو قوم نے یحییٰ خاں کے ساتھ کیا۔

ہاں تو مَیں بات مرغی کے گوشت اور اُن کے نہ کھانے کی کر رہا تھا۔ ایک دعوت میں جس میں سامانِ اشتہا بہت وافر تھا۔ ان کے بہت سے عزیزوں کے ساتھ، بندہ بھی حاضر تھا۔ اسی لیے میں نے اشتہا کا لفظ لکھا ورنہ دعوتِ تکلّف کہتا۔ کیونکہ لکھنؤ والے تو کھانے کی بجائے سونگھنے پر بھی گزارہ کر لیتے ہیں۔ غرض اُس دعوت میں کسی نے ان سے کہہ دیا: "مرغی بھی تو کھائیے"۔

اِن کے ایک عزیز نے جو جانتے تھے کہ یہ مرغی نہیں کھاتیں۔ ازرہِ شرارت لقمہ دیا۔

یہ مرغی نہیں کھاتیں سُوئر کھاتی ہیں۔

یہ بات سُن کر کچھ لوگ چُپ ہو گئے۔ کچھ سنّاٹے میں آ گئے۔ مگر انہوں نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ یہ خدیجہ مستور سے صابرہ شاکرہ بن گیئں۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے دوبارہ وہی فقرہ دہرایا۔ یہ پھر چُپ، جیسے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔ لیکن جب تیسری بار انہوں

نے وہی فقرہ ادا کیا کہ یہ مرغی نہیں کھاتیں سُوئر کھاتی ہیں تو انھوں نے نہایت اطمینان سے کہہ دیا" میں نے آپ کو کب کھایا ہے ؟"

خدیجہ بہن کا موڈ دل لگی کا ہو تو پھر انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ تفنّن کی آمد پر، ان کا سنبھل جانا کچھ آسان نہیں، اُڑان کا یہ ہے کہ افسانہ نگار ہیں۔ وقت کے وقت کہانی گھڑ سکتی ہیں۔ کہانی بھی ایسی، جس میں جھوٹ کا کم، اصل کا گمان زیادہ ہو۔ ایک بار انھوں نے مجھے بھی مخمصے میں ڈال دیا۔ میری بیوی سے کہہ دیا" اپنے میاں کو ذرا کَس کے رکھئے کیونکہ آج کل میں ان کے بارے میں عجیب عجیب باتیں سُن رہی ہوں "۔

بیویوں کو ایسے بڑھاوے خدا دے۔ اس پر میری بیگم نے جھٹ کہا" آپ سُن رہی ہیں تو میں دیکھ رہی ہوں "۔

[یہ قدرے اچھل کر] " اچھا دیکھ بھی رہی ہیں ؟"

ہر وقت کھوئے کھوئے رہتے ہیں اور ہائے ہائے کرتے رہتے ہیں۔ [صراحت: ان میں سے پہلی بات یعنی کھوئے کھوئے رہنے والی صحیح ہے مگر دوسری بات غلط ہے۔ یعنی ہائے ہائے کرنے والی]

بیوی جس مخلوق کا نام ہے۔ خُوب ہے۔ رنگینی ہی رنگینی، پریشانی ہی پریشانی، وہ اور کچھ ہو یا نہ ہو، بدگمانیوں کی پوٹ ضرور ہے۔ میری بیوی ہو یا کسی اور کی بیوی، اس معاملے میں سب کا حال ایک سا ہے۔ ان میں سے کسی سے بھی اگر کوئی یہ کہہ دے کہ تیرا میاں مسجد سے نماز پڑھ کے نکل رہا تھا تو اس صورتِ واقعہ پر بیش تر دخترانِ حوّا کو یقین نہ آئے گا۔ لیکن اگر کوئی یہ کہہ دے کہ آج کل آپ کے میاں کی شامیں رنگین ہو رہی ہیں

تو اس داستانِ باطل پر سب ایمان لے آئیں گی۔ اجتماع بھی ہوا تو کہاں ؟ بلکہ مجھ سے زیادہ دانا یہ کہتے ہیں کہ بابا یہ بیویاں ایسے شکوک کو تو زوجیت کے فرائض میں سے سمجھتی ہیں۔

چنانچہ میں نے بھی دیکھا کہ گھر کا نقشہ ایک دم بدل گیا ہے۔ ہلکا ہلکا شکایت آمیز ماحول، آہیں بھرنا اور اللہ کو یاد کرنا روزمرّہ ہوگیا۔ تین چار دن تو میں نے بھی ناسازئ طبع کی رعایت دیکھ کر چُپ رہنا مناسب سمجھا لیکن پانچویں چھٹے روز پوچھ ہی ڈالا۔" جانِ من کیا بات ہے ؟"

"کچھ نہیں۔"

اس جواب پر میں سوچنے لگ گیا۔" ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔"

اُدھر رویّہ یہ جیسے سمجھا رہی ہوں۔" دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھُلا۔"

چنانچہ میں نے بازی گر سے زیادہ سویٹ سا شوہر بن کر پوچھا۔" اے نیک بخت! بتا تو دے کہ آج کل علمِ منطق کا کون سا مسئلہ سُلجھا رہی ہیں ؟"

پہلے خاموش، میرے ہر اصرار پر چُپ، میری ہر خوشامد پر سکوت، بالآخر میری لجاجت پر پہلے تو تھوڑا سا سنبھل کر پھر قدرے بپھر کے بولیں۔" میں سارا کچّا چِٹھّا جانتی ہوں۔ خدیجہ بہن نے مجھے سب ۔۔"

میں نے جب بھی کوئی خاص نمبر چھاپا تو یہ بھی چاہا کہ اس کی تقریب بھی ہو۔ چونکہ مجھے جلسہ کرنا یا کرانا ہوتا ہے اس لیے مضمون نگاروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے جب بھی خدیجہ بہن سے قصیدہ پڑھنے کو کہا۔ انہوں نے کبھی بھی آلے بالے سے کام نہ لیا۔ حالانکہ تکلّف، پہلوتہی اور بے نیازی عورتوں کا زیور ہے مگر انہوں نے کبھی

بھی ایسے نسوانی ہتھیاروں سے کام نہ لیا۔ بلکہ ہمیشہ کہا "ہاں بھائی! ضرور ضرور! میں مضمون نہ پڑھوں گی تو اور کون پڑھے گا۔ میرا حق سب سے زیادہ ہے"۔ ایسے مواقع پر میں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ اس تقریب کی مجھے اُتنی خوشی نہیں ہوئی۔ جتنی کہ انہیں، میرا خیال ہے کہ یہ کردار کا ایسا رُخ ہے جس پر کم ظرفی کے گنہگاروں کو تھوڑا سا شرمندہ ہو ہی جانا چاہیئے۔

انہیں دوسروں کو چڑانے کا بھی شوق ہے۔ چشمِ بددور! مثال کے طور پر یہ مجھ سے کہیں گی آپ نے اب کے نقوش میں کیا لکھ دیا ہے۔ یا یہ کہ فلاں افسانہ کیوں چھاپا؟ میری کمزوری یہ ہے کہ میں نقوش کے خلاف کچھ نہیں سُن سکتا۔ پہلے پہل تو میں خوب سٹپٹایا کرتا تھا۔ دلیلوں پہ دلیلیں دیا کرتا تھا۔ یہ محظوظ ہوا کرتی تھیں کہ تیر نشانے پہ لگا مگر اب میں، ان کی چال کو سمجھ گیا ہوں۔ یہ اگر اب کہتی ہیں کہ بھئی یہ نقوش میں کیا لکھ دیا تو میں جواب میں کہتا ہوں۔ جھک ماری ہے۔ یا اگر یہ کہیں کہ فلاں چیز کیوں چھاپی؟ تو میں کہہ دیتا ہوں غلطی ہو گئی بڈھی ہی ایسی پائی ہے کیا کروں؟ لہٰذا اب، ان کے محظوظ ہونے کے ایسے تمام حیلے ختم ہو گئے ہیں جس کا افسوس جانبین کو ہے مگر یہ اختراع پسند ذہن مجھے ایک بار پھر پٹخنی دیگا۔ اب بھی مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پوری آن تان کیساتھ کہہ رہی ہوں کہ تم اگر اتنے چوکس ہو گئے ہو تو پھر کیا میری چوڑیاں ٹوٹ جائیں گی؟ میری بلا سے ہُنہ!

یہ گفتگو میں کافی حد تک شگفتہ رُو ہیں۔ کوئی منہ بسورے یہ انہیں پسند نہیں ۔ خوش رہو اور خوش رکھو یہ ان کا رویّہ ہے۔ اس کھاتے میں سے ایک بات سُن لیں۔ ہے تو ذرا اخفا کی۔ مگر مَیں آپ سے عورتوں ہی کی زبان میں کہتا ہوں "بہن یہ بات

کسی اور سے نہ کہیے گا۔" ہاں تو میں بات ان کی شگفتہ رُوئی کی کر رہا تھا۔ ایک دن کہہ رہی تھیں "میں نے خواہ مخواہ اتنی بڑی کوٹھی بنوالی۔"

میں نے کہا "جب بچے جوان ہو جائیں گے تو آپ کو یوں محسوس نہ ہو گا۔"

کہنے لگیں "ماں باپ نے تو کُل دو بچے پیدا کیے۔ یہ کیا کھا کے زیادہ بچے پیدا کریں گے۔"

ایک دن یہ اپنے ماموں ڈاکٹر فاروقی کے مطب میں گیئں تو وہاں اُسی وقت ایک ایسا بیمار بچہ پہنچا جسے ۱۰۶ بخار تھا۔ بُری حالت، دماغ پہ بھی اثر تھا۔ آنکھیں بھی کچھ پتھرائی پتھرائی سی تھیں۔ بچے کی ماں تھی کہ دھاڑیں مار مار کے رو اور کہہ رہی تھی۔ "ڈاکٹر صاحب میرے بچے کو بچا لیجئے، میرے بچے کو بچا لیجئے"۔ بچے کی حالت اور ماں کی آہ و بکا سُن کر محترمہ خدیجہ مستور صاحبہ خود اپنی بات بھول گیئں۔ ہاتھ پاؤں پُھلا بیٹھیں۔

جب ڈاکٹر صاحب نے بچے کو انجکشن لگانا چاہا تو بچے کی ماں نے ان سے کہا۔ "مجھ سے یہ برداشت نہ ہو گا۔ ذرا آپ مدد کریں اور بچے کو پکڑ کر انجکشن لگوا دیں تو اوروں نے یہ دیکھا کہ ان کی حالت بچے کی ماں سے زیادہ خراب ہو گئی۔ اتنی بھی لہو کی ہلکی کیا کہ پسینہ چھوٹ رہا ہے۔ تھر تھر کانپ رہی ہیں۔

اس پر ڈاکٹر صاحب نے ظہیر بابر سے کہا: "انہیں یہاں سے فوراً لے جائیں۔ ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ چنانچہ ظہیر بچے کو جلدی سے انجکشن لگوا کر اپنی گڑیا کو لے کر وہاں سے نکل آئے اور وہ مسئلہ بیچ ہی میں رہ گیا۔ جس کے لیے یہ ڈاکٹر صاحب

کے پاس پہنچی تھیں۔

رات بھر نیند نہ آئی۔ بچہ رات کو بھی انہیں ویسا ہی تڑپتا ہوا نظر آتا رہا آنکھوں تلے پھرتا رہا۔ ماں کی بھی ویسی ہی آہ وزاری سے واسطہ رہا۔ چنانچہ صبح ہی صبح ظہیر سے بہانہ کر کے پھر ڈاکٹر صاحب کی طرف چل دیں۔ کہا یہ کہ سر میں شدید درد ہے۔ چنانچہ جیسے ہی موٹر مطب کے سامنے رُکی۔ یہ اُس میں سے جلدی سے اُتر کر مطب میں پہنچیں پہلے کمپونڈر سے مڈبھیڑ ہوئی۔ پوچھا "کل والے بچّے کا کیا حال ہے؟" کمپونڈر نے بتایا " وہ ٹھیک ہوگیا۔ اُس کی ماں نے تھوڑی دیر پہلے مٹھائی بھی بانٹی تھی"۔ چنانچہ یہ اُلٹے پاؤں واپس آکر پھر موٹر میں بیٹھ گئیں۔ ظہیر نے پوچھا "کیا ڈاکٹر صاحب نہیں ملے؟"

انہوں نے کہا "ڈاکٹر صاحب نہیں ملے۔ لیکن مرض جاتا رہا"۔

یہ جتنا ہنستی ہیں، اتنا ہی روتی بھی ہیں۔ یا یہ کہ یہ روتی بھی ہیں، ہنستی بھی ہیں۔ دھاروں دھار روتی ہیں اور کھُل کر ہنستی ہیں۔ نہ کمی اس میں نہ کمی اُس میں، آج تک کوئی اس امر کا فیصلہ نہیں کر سکا کہ روتی زیادہ ہیں یا ہنستی زیادہ ہیں۔ نہ رونا ان کے اختیار میں ہے نہ ہنسنا ان کے بس میں، رونا حالات کے تحت ہو جاتا ہے۔ ہنسنا افتادِ طبع کے صدقے میں، یوں گنگا جمنی قسم کی ہستی، جب پبلک کے سامنے آتی ہے تو اتنی سنجیدہ نظر آتی ہے کہ جیسے انہوں نے نہ تو کبھی رو کے دکھایا ہو اور نہ کبھی ہنس کے دیا ہو۔

اگر آپ کو دلچسپی ہو تو میں ذرا وضاحت کے ساتھ یہ بتا سکتا ہوں کہ میں انکے

رونے اور ہنسنے کا راز جانتا ہوں کہ یہ روایتی شہزادیوں کی طرح ہنستی اور روتی کیوں ہیں۔ یہ ہنستی اس لیے ہیں کہ حالات نے ہم سے ہنسی چھین رکھی ہے۔ انتقاماً ہنستی ہیں۔ یہ روتی اس لیے ہیں کہ ناخداؤں نے حالات ہی ایسے پیدا کر رکھے ہیں۔ اس لیے کوئی ان سے زیادہ کیوں روئے ؟

میں پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں کہ یہ گلے شکوے کرنے میں بڑی ماہر ہیں۔ مگر میں جو یہاں عرض کرنے والا ہوں وہ میری کہی ہوئی بات کا دوسرا رُخ ہے۔ کہہ چکا ہوں کہ اکثر کوئی نہ کوئی شکوہ، کوئی نہ کوئی گِلہ ان کی زبانِ شیریں بیان سے سُننے میں آتا ہی رہتا ہے۔ شکوہ بغرض جھگڑا نہیں ہوتا بلکہ گِلہ بغرض اپنایت ہوتا ہے۔ غرض تعلقات کو رفو کرنے کا سلیقہ جیسا انہیں ہے، کم کسی کو ہوگا۔ اس پر بھی بات اُس حد تک پہنچ جائے جسے جھگڑا ہی کہتے ہیں تو یہ کنّی کترانا شروع کر دیں گی اور اگر فریقِ مخالف خم ٹھونک کے سامنے آجائے تو یہ میدان چھوڑ کے ایسے بھاگتی ہیں جیسے پورس کی فوج کا کوئی ساڑھی والا سپاہی! حالانکہ بعض عورتیں اتنی تتیا مرچ ہوتی ہیں کہ پناہ بخدا !

جس طرح آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ یہ مرغی کا گوشت نہیں کھاتیں۔ اُسی طرح اگر آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ کیلا نہیں کھاتیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے ایک دفعہ کراچی کے کسی اخبار میں یہ سرخی پڑھی تھی کہ خدیجہ مستور نے کیلا کھانا چھوڑ دیا ہے مگر میں کسی وجہ سے وہ مضمون نہیں پڑھ سکا تھا۔ ایک دُبدا سی تھی کہ آخر کیوں ؟

ایک دن ہم لوگ چائے پی رہے تھے۔ میز پہ پھل بھی رکھے تھے۔ خدیجہ نے کہا "بھائی کیلا بھی تو کھاؤ"۔

"کیلا؟"

"ہاں ہاں!"

"جناب ہم تو کیلا اُس وقت تک نہ کھائیں گے۔ جب تک کہ —"

"جب تک کیا؟"

"جب تک آپ یہ نہ بتائیں گی کہ آپ کیلا کیوں نہیں کھاتیں!"

"بس؟"

"جی!"

بھئی قصّہ یہ ہے کہ میں اور ظہیر کہیں جا رہے تھے۔ موٹر میں کیلے بھی پڑے تھے میں نے اُن میں سے ایک کیلا کھا کر چھلکا سڑک پر پھینک دیا۔ اس پر ظہیر نے کہا "آپ نے جو چھلکا سڑک پر پھینکا ہے۔ اُس پر سے ضرور کوئی پھسلے گا۔"

چنانچہ میں نے ظہیر سے کہا "واپس چلو۔ میں سڑک پر سے چھلکا اُٹھاؤں گی مگر ظہیر نہ مانے اُس دن سے میں کیلا نہ کھا کر اپنے آپ کو سزا دیتی رہتی ہوں۔"

یہ کیا کیا نہیں کھاتیں وہ تو میں نے آپ کو بتا دیا مگر یہ نہیں بتایا کہ مرغوب کیا کچھ ہے۔ انہیں عورتوں کی طرح چٹپٹی اور کھٹّی میٹھی چیزیں کھانے سے اتنی محبّت نہیں جتنی کہ چیکسلی عورتوں کو ہوتی ہے۔ اگر ہے تو یہ راز ہے۔ جس کا مجھے علم نہیں۔ ہاں کھانے کے سلسلے میں مجھے ان کی ایک کمزوری کا علم ہے جو میرے لیے عافیت کا درجہ بھی رکھتی ہے۔

عافیت اِن معنوں میں کہ اگر یہ مجھ سے خفا ہوں تو میں جان بوجھ کر تھوڑے دن اور چُپ رہوں گا۔ پھر ایک دن ٹیلیفون کروں گا "اب کے اتوار کو آئیے گا۔ آپ کو نہاری

کھلاؤں گا۔"

"نہاری؟"

"ہاں ہاں۔"

"بھائی آپ کے منہ میں گھی شکر!"۔ لیجئے سب ناراضی دُور! بلکہ پوچھا یہ جا رہا ہے کہ اُس اتوار میں، اِس وقت سے لے کر اُس وقت تک کتنے گھنٹے اور کتنے سیکنڈ باقی ہوں گے۔ غرض خدا کی باقی نعمتوں کی طرف ان کی توجہ اتنی نہیں جتنی کہ کم بخت نہاری کی طرف!

یہ بہت باتدبیر اور سلیقہ مند خاتون ہیں۔ آج کے بارے میں کم کل کے بارے میں زیادہ سوچتی ہیں دیکھ لیجئے ہم سب میں سے اکیلی انہوں نے ہی اپنی ایک اچھی سی کوٹھی بنائی ہے اور کسی کے پاس کار بھی نہیں۔ ان کے پاس کار بھی ہے۔ گھر میں بھی اچھے خاصے ٹھاٹھ سے رہتی ہیں۔ یہ سب باتیں آسودگی سے زیادہ ان کی تدبیر کاری کا نتیجہ ہیں۔

کوٹھی کی بات ہوئی ہے تو یہ بھی سُن لیجئے۔ جب انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ کوٹھی کو میں نے خود اپنی نگرانی میں بنوایا ہے تو میں ہنس دیا مگر جب انہوں نے تفصیلات بتانی شروع کیں کہ دیکھئے یہ ڈرائینگ روم میں جھرنے میں نے رکھوائے ہیں۔ الماریوں کا یہ انداز میری اختراع ہے۔ وہ سامنے والی دیوار میری اپج کا نتیجہ ہے تو میں سوچنے لگ گیا کہ کہیں استاد احمد معمار لاہوری کی روح تو ان میں حلول نہیں کر گئی۔ پھر جو انہوں نے خرچ کا حساب بتایا تو معلوم ہوا جیسے انہوں نے سب کو لُوٹ لیا ہو۔ یوں جب میرے چہرے کو سوالیہ نشان بنا دیکھا تو پوچھا "کیا بات ہے؟"

"معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے کسی کو کچھ نہیں دیا۔"

"ارے صاحب دیا کیوں نہیں؟ اُجرت کے ساتھ ساتھ چائے بھی پلائی ہے۔ مرغے بھی کھلائے ہیں۔"

انہیں زیادہ بننے سنورنے کا شوق نہیں۔ جیسے قرۃ العین، جیسے ممتاز شیریں، جیسے حجاب امتیاز علی، یہ تو بہت سیدھے سادے انداز میں اپنے آپ کو رکھتی ہیں۔ اتنے سیدھے سادے انداز میں کہ وہ کچھ ایسی بیگمات پر سجنا بھی نہیں۔ مسّی کاجل، سُرخی غازہ کچھ بھی نہیں۔ یعنی موٹر میں بیٹھی ہیں اور چار آنے کی لپ اسٹک بھی ہونٹوں پہ آویزاں نہیں۔ کوٹھی میں رہتی ہیں۔ دیواروں پہ جتنا رنگ اور چونا کام آیا ہے اس کا عشر عشیر بھی چہرے پہ آراستہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے کبھی کبھی ایک بیگم صاحبہ یاد آجاتی ہیں۔

مَیں بھی کبھی ایک بیگم صاحبہ سے ملنے گیا تھا۔ ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ انتظار کیا۔ زیارت نہ ہوئی۔ پھر انتظار کیا پھر زیارت نہ ہوئی۔ بالآخر تنگ آکر پوچھ ہی لیا "بھئی کہاں ہیں بیگم صاحبہ؟"

"جی وہ سج رہی ہیں۔"

یہ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔ زبان گھر کی لونڈی والا محاورہ، جیسا ان پہ صادق آتا ہے کم ادیبوں پہ صادق آتا ہوگا۔ اس کے باوجود زبان دانی کا غرّہ نہیں۔

جھوائی ٹولہ کے آس پاس ہی کہیں کشمیری محلہ ہے۔ جھوائی ٹولہ میں خدیجہ مستور رہتی تھیں۔ کشمیری محلّہ میں نواب جعفر علی خاں اثرؔ، انہیں کبھی اہلِ زبان ہونے پر اتراتے نہ دیکھا۔ انہیں کبھی افتخار کی اس سیڑھی سے اُترتے نہ دیکھا۔

اثرؔ صاحب کو اکثر یہ کہتے سُنا "ارے صاحب وہ کیا جانیں، شعر کہنا کس چڑیا کا نام

ہے۔ انہیں تو زبان ہی نہیں آتی۔ زبان کی نزاکتیں معلوم، فراق جیسے شاعر کو بھی انہوں نے کئی بار، نقوش ہی کے صفحات میں زبان سکھائی۔ غرض زبان کی موچ جیسی وہ نکالا کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی نہیں نکالی۔

صرف ایک بار، میں نے سُنا کہ انہوں نے کہا کہ فلاں بی بی نے جو اس موقع پر یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ وہ غلط ہے۔ ہم تو اس موقع پر یہ لفظ بولتے ہیں۔ میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی کیوں کہ مسئلہ صرف زبان کا نہ تھا صنف کا بھی تھا۔

ایک کتاب کی تعارفی تقریب تھی مصنّفہ قابلِ ذکر حد تک جانی پہچانی شخصیّت تھیں مگر اُس محفل میں ایک مضمون نگار نے اُن کی شخصیّت کے اظہار میں، کچھ ایسی نامناسب باتیں بھی کہہ دیں جنہیں "شرفا" اب تک صرف ڈرائنگ روموں ہی میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا کرتے تھے لیکن برسرِ جلسہ نہیں ہوتی تھیں۔

اخباروں میں بھی شور مچا، گھر بیٹھے اوسان ان کے بھی خطا ہو گئے۔ مجھ سے کہنے لگیں "سُنا بھائی! کل کی تقریب میں کیا ہوا؟"

"بہت افسوس ہُوا۔"

"افسوس سا افسوس، عورت کی ایسی بے حُرمتی کا حال سُن کر، میرا تو مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ اُس بے چاری پہ نہ جانے کیا گزری ہو گی۔"

اُس بے چاری پہ نہ جانے کیا گزری ہو گی —— یہ ورد ان کی زبان پر کئی دنوں تک جاری رہا۔ انہیں صرف اپنی لاج ہی کا نہیں، دوسروں کی عزّت کا بھی پاس بہت ہے۔ یہ ہر کسی گھٹیا بات پر تلملا اُٹھتی ہیں۔ چہرہ سُرخ کر لیتی ہیں۔

اگر یہ کوئی غلطی کر بیٹھیں تو اس کا ذکر خود ہی مزے لے لے کر کر دیتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ کوئی دوسرا، ان کی غلطی پر ہنسے ۔ یہ خود کیوں نہ ہنسیں اور ہنسائیں۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ حسِ لطیف کی رمق باقی ہو۔ عنقا نہ ہو۔ اپنا مذاق اُڑانا انہی کا حصّہ ہے اور اس سلسلے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ کم از کم میرے علم میں نہیں جو اپنا مذاق اس شان سے اُڑاتا ہو۔

میں چراغ حسن حسرتؔ کی محفلوں میں بھی بیٹھا ہوں۔ مولانا عبد المجید سالکؔ کے ساتھ بھی اُٹھا بیٹھا ہوں۔ شوکت تھانوی سے تو واسطہ ایسا تھا۔ جیسے ہم ایک دوسرے کا سایہ ہوں۔ ان سب کی گفتگو میں، بات بات سے نکتے اُچھلتے اور لطیفے پھوٹتے تھے۔ خُوب خُوب محظوظ ہوا ہوں۔ میری طبیعت میں جو بیوست کی کمی واقع ہوئی ہے وہ کچھ انہی حضرات کی دین ہے۔ مگر جب میں یہ سوچتا ہوں کہ عورتوں کی شوکت، حسرت، سالک کون ہیں تو خدیجہ سامنے آ کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ اُس پایہ کی بذلہ سنج اور نکتہ آفرین ہیں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ خواتین میں مجھے ایسی مفرّح قسم کی گفتگو کرنے والی اور خاتون نظر نہیں آتی۔ سوائے اس فرق کے کہ اُن کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی خلق خدا کے لیے تھی۔ انہوں نے اپنے جوہر کو گھریلو مسئلہ بنا رکھا ہے۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ ہماری کبھی کبھی مہینوں ملاقات نہیں ہوتی۔ تب رابطہ ٹیلی فون کے ذریعہ پیدا کیا جاتا ہے۔ گورنمنٹ ہم سے بیس پیسے فی کال وصول کرتی ہے۔ لیکن خدیجہ ٹیلی فون سے کم سے کم دو سو پیسے وصول کرتی ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے بڑے بڑے منافع خوروں کو بھی مات کر رکھا ہے۔ یعنی ہم بچّوں کی صحت اور اُن کی تعلیم سے لے کر، باورچی خانے کے پکوان تک کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک دن ٹیلی فون

آیا۔ میں نے پوچھا" بچے کیسے ہیں اور کیا کر رہے ہیں ؟"

کہنے لگیں " بڑا بچہ تو امروز کے دفتر، ایڈیٹری کرنے گیا ہوا ہے (یعنی شوہر) چھوٹا بچہ (یعنی کہ بیٹا) دوست سے ملنے گیا ہوا ہے۔ میں اور کرن گھر پہ ہیں۔ میں آپ کو ٹیلیفون کر رہی ہوں اور وہ پڑھ رہی ہے"۔

میں نے کہا " بڑے بچے کی خوب کہی"۔

" ہاں ہاں، جو شخص اپنے آپ میں ڈوبا ہوا ہو۔ اُس کا خیال بالکل بچوں ہی کی طرح رکھنا پڑتا ہے"۔

" اچھا تو ہاجرہ کا کیا حال ہے۔ ٹیلیفون آیا ؟"

" وہ تو مجھے ٹیلیفون کم کرتی ہیں کیوں کہ ان کا بجٹ خراب ہو جاتا ہے۔ ویسے پچھلے دنوں ان کا ٹیلی فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں " خدیجہ میرے لیے ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا خرید لینا۔ کیوں کہ میں عمر کا آخری حصہ لاہور میں گزارنا چاہتی ہوں"۔ اس پہ میں نے اُسے کہا " بہن تُو نے تو زندگی کے بڑے لمبے پلان بنا رکھے ہیں"۔

میں نے آپ کو دو سو پیسے وصول کرنے والی کال میں سے، ابھی اُس کا صرف ابتدائیہ سنایا ہے۔ متن تو ابھی بہت پڑا ہے۔ یہاں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ ہے ان کی گفتگو کا انداز، کچھ سجیلا، کچھ کٹیلا، جس میں تصنع کا شائبہ نہیں بلکہ شگفتگی اور طنز کا ایک ایسا ملا جلا سا انداز ہے۔ جسے سُن کر حسب توفیق لطف بھی اُٹھایا جا سکتا ہے۔ عبرت بھی پکڑی جا سکتی ہے۔

یہ خود دھان پان قسم کی خاتون ہیں۔ مگر دلیر بہت ہیں۔ سوائے سانپ کے کسی سے نہیں ڈرتیں۔ اللہ میاں سے بھی کچھ واجبی سا ہی ڈرتی ہیں۔ یعنی اللہ میاں سے زیادہ

سانپ سے ڈرتی ہیں۔ وہ بھی محض احتیاط کے تقاضوں کی وجہ سے، جیسے حضرت علیؓ نے ایک کافر سے کہا تھا "اگر اللہ میاں نکل آئے تو!"

اگر رات کو کوئی مہمان آجائے تو اُسے خود موٹر پہ گھر چھوڑنے جائیں گی۔ ظہیر کو یکلے نہ جانے دیں گی۔ ان کے نزدیک گھر کی حفاظت اتنی ضروری نہیں جتنی کہ میاں کی حفاظت!

یہ پاکستان کے بنتے ہی لکھنؤ سے ہجرت کر کے لاہور آگئی تھیں۔ انہیں بیس سال سے کچھ زیادہ ہی عرصہ لاہور میں رہتے ہوئے ہوا ہوگا۔ پھر ان کی شادی بھی پنجابی گھرانے میں ہوئی مگر انہوں نے آج تک شلوار قمیص پہن کے نہیں دکھائی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ بے شک اُردو بولنا نہ چھوڑیں مگر شلوار قمیص تو پہنیں مگر یہاں بات اُلٹی ہے۔ یہ کبھی کبھی پنجابی کا جھٹکہ تو کر دیتی ہیں لیکن ـــــ

آئندہ اگر کبھی میں نے احباب کی دعوت کی تو وہ شاید اس امر کا اعلان ہو کہ لیجئے اب تو خدیجہ نے بھی شلوار قمیص پہن لی۔ حالانکہ ان کی ساری بہنیں شلوار قمیص بھی پہنتی ہیں مگر یہ ابھی تک لباس کی حد تک لکھنؤ سے باہر نہیں نکلیں۔

یہ سیاسی طور پر بے حد بیدار ہیں۔ جب موضوعِ گفتگو سیاست ہو تو یہ پھر زنانہ لب و لہجہ میں بات نہیں کرتیں۔ بلکہ ان کا انداز مجاہدانہ ہوتا ہے۔ یعنی یہ چوڑیاں پہن کے گھر بیٹھ رہنے پر پرچم اٹھا کے اور آگے بڑھنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ یہ استبداد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتی ہیں۔ ایسے مواقع پر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ جانِ ناتواں، مرقعِ شرم و حیا، اپنے اندر کتنا جرأت مندانہ غرور رکھتی ہیں۔

ایک بار جب ظہیر بابر گرفتار ہو گئے تو ہم اُن کے یہاں افسوس کے لیے پہنچے۔

مگر ان کا انداز یہ تھا کہ جیسے یہ کوئی خوشی کا مقام ہو۔ ہم گھما پھرا کے ظہیر کی گرفتاری کی بات کرتے تو یہ جواب میں کہتیں "چھڈو جی کوئی ہور گل کرو"

انہوں نے تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں بھی بڑا کام کیا۔ خواتین کے ملّی شعور کو بیدار کیا۔ گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھر کر مقصد کے حصول کے لیے سعی کی۔ پردہ دار خاتون ہونے کے ناطے سے، انہیں جتنی دشواریوں کا سامنا ہوگا وہ عیاں ہے۔ یہ وہ خاتون تھیں جو اُن دنوں ڈاکٹر کے پاس بھی پالکی میں بیٹھ کر جایا کرتی تھیں۔ مگر قومی جدوجہد کے سلسلے میں گھر سے نکل کھڑی ہوئیں۔ صعوبتیں برداشت کیں مگر قدم نہ ڈگمگائے۔ اس ضمن میں ان کا ایک خط میں نے بھی دیکھا ہے جو ۱۹۴۶ء کا نوشتہ ہے اور جو میرے پاس خطوط نمبر کی اشاعت کے سلسلے میں پہنچا تھا۔ سرنامے پر لکھا ہے۔ پاکستان زندہ باد، جس شہر سے لکھا گیا تھا وہ ہے آگرہ!

وہ خط کوئی ادبی پہلو نہیں رکھتا مگر ان کی قومی جدوجہد کا ایک باب ضرور ہے۔ لکھنؤ کی ایک پردہ دار خاتون، جو آواز تک کا پردہ کرتی تھیں آگرہ تک جا پہنچیں تاکہ قوم کی بیداری میں ان کا بھی حصّہ ہو۔

جب سے پاکستان بنا ہے یہ بھی سیاسی اعتبار سے مضطرب رہی ہیں اور نہ جانے انہیں اور ہمیں ابھی اور کتنا تڑپنا ہوگا۔ تفصیل میں جاؤں گا تو کلیجہ اور چھلنی ہوگا۔ جذبات اور لہولہان ہوں گے۔ اب تو شاید اس قوم کو صورِ اسرافیل ہی جگائے تو جگائے۔

یہ عورت ہے۔ اس لیے کمزور ہے۔ یہ مرد ہے اس لیے برتر ہے۔ اس کُلیّے سے انہیں بڑی نفرت ہے۔ ان کے خیال میں بس اتنا ہی کافی ہے کہ عورت عورت ہے اور

مرد مرد ہے۔ ایک دوسرے پر فضیلت کیسی؟ بس اپنا اپنا دائرۂ کار ہے۔

واقعہ بھی یہ ہے کہ جب تک مرد اپنے دماغوں میں روشن دان نہیں رکھیں گے، اُس وقت تک ہم عورتوں کے ساتھ انصاف کر ہی نہ سکیں گے۔ یا پھر جب تک بہت سی خدیجائیں اور عصمتیں پیدا نہ ہوں گی اُس وقت تک مرد اکڑفوں کے مرض میں ضرور مبتلا رہیں گے۔ میرے نزدیک اکڑفوں کا مرض دق کے مرض سے کم مہلک نہیں۔ ایک جسم کو اندر ہی اندر کھاتا ہے۔ دوسرا قوم کو بالا ہی بالا۔

کبھی کبھی تو یہ ایسی چکرا دینے والی بات کر جاتی ہیں کہ مجھ ایسے یہ محسوس کرنے لگ جاتے ہیں کہ اصل میں ناقص العقل مرد کی ذات ہے۔ عورت کی ذات نہ تھی اور اگر عورتیں واقعی ناقص العقل ہوتی ہیں تو پھر یہ کسی صورت سے عورت نہیں ہیں۔

کہتے ہیں کہ عورتوں کے حافظے نے بو علی سینا کے حافظے کو بھی مات کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں جب بھی آپس میں ملیں گی تو بات پہلے "اے بہن!" سے شروع کریں گی۔ اس کے بعد تبادلۂ خیالات کے طور پر زندگی کے ہر ورق کو اُتھل پتھل کے رکھ دیں گی اور اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گی جب تک کہ بات کو تُو تُو تکار تک نہ پہنچا دیں گی یعنی جب تک کہ زبان کی قینچی سے محلّے بھر کا ذہنی قیمہ نہ کر ڈالیں گی۔ مگر خدیجہ میں ایک عیب یہ بھی ہے کہ میں نے انہیں محقق بنتے کبھی نہیں دیکھا۔ یعنی زندگی کے ورق ورق کو موضوعِ بحث بناتے نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی بات کو اے بہن! سے شروع نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی محلّے بھر میں عورتوں والی شہرت ذرا کم ہی ہے حالانکہ پڑوسیوں نے کئی بار حالات بھی ایسے پیدا کر ڈالے۔ اس کے باوجود انہوں نے

اُن سنہری موقعوں سے بھی فائدہ نہ اُٹھایا۔ یہ خواہ مخواہ ہی ایک چُپ سوسکھ والے جُرم کا ارتکاب کرتی رہتی ہیں ۔

انسان کے اصل کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے سے کمزوروں کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے۔ اپنے سے کم رُتبہ رکھنے والوں کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہے کیونکہ اصل سے خطا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں والا قصّہ یونہی تو وجود میں نہیں آیا ہوگا۔ محض شیریں کلامی سے، کسی بھی شخص کی بڑائی کا اندازہ لگانا شرافت و نجابت کی لغت میں بھٹکنے کے سوا کچھ نہ ہوگا ۔

میں نے دیکھا ہے کہ ان کے گھر میں جو نوکر ہے ۔ وہ برسوں پرانا ہے۔ کوئی اسے کتنا ہی لالچ دے وہ اس گھر کی چوکھٹ نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کا وجود گھر میں گھر کے ایک فرد کا سا ہے ۔ وہ بھی اہلِ خانہ کی خدمت اس طرح کرتا ہے ۔ جیسے مرید پیر کی کرتا ہے۔ بچھا چلا جانا ، جان تک نچھاور کر دینا ۔ اِدھر یہ بھی ان کا اتنا خیال رکھتی ہیں کہ کیا مجال کوئی بھی بات اس کی منشا و مرضی کے خلاف ہو جائے ۔ ہر پھر کر بات وہیں پہنچے گی ۔ گھر کی سوبھا گھر والی کے سنگ !

غیبت جو عورتوں کا اضافی حُسن ہے وہ ان میں قدرے کم ہے ۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ وصف ان میں سرے سے ہے ہی نہیں تو یہ ان سے صنفانہ زیادتی ہو جائے گی ۔ یعنی ان میں یہ خوبی اس حد تک تو نہیں جسے لگائی بجھائی کہتے ہیں بلکہ صرف اِس قدر ، جسے شرفا حظ اٹھانا کہتے ہیں ۔ اوروں کی بات نہیں کرتا۔ اپنی کہتا ہوں کہ مجھے تو عورت کی ذات میں اُن کی ہر بات میں حُسن ہی حُسن نظر آتا ہے ۔ خواہ وہ جھوٹ ہی کیوں نہ بول رہی ہو ۔

یہ میری طرح صورت سے بہت بھولی لگتی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ حد درجہ زیرک، زیرکی مائل بہ ہوشیاری نہیں بلکہ مائل بہ دانشمندی، اگر بات کو طول دینا مقصود نہ ہو تو امر واقعہ کو اس حد تک مختصر کیا جاسکتا ہے کہ ان کی گفتگو میں تلوار کی کاٹ اور شہد کی مٹھاس ہے۔

جس طرح یہ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں سادگی پسند ہیں اُسی طرح یہ اپنی تحریروں میں بھی الفاظ کے ٹھاٹھ باٹھ کو پسند نہیں کرتیں۔ انھوں نے نہ تو کبھی اپنی شخصیت میں آرائش کے پُھندنے لگائے اور نہ ہی کبھی اپنی تحریروں میں ابوالکلامیّت کو اپنایا۔ جیسے ان کی تحریروں میں لفظوں کی کہکشاں سی رواں دواں نظر آتی ہے۔ بالکل ویسے ہی ان کی شخصیّت میں حلم کی دولت ارزاں محسوس ہوتی ہے۔

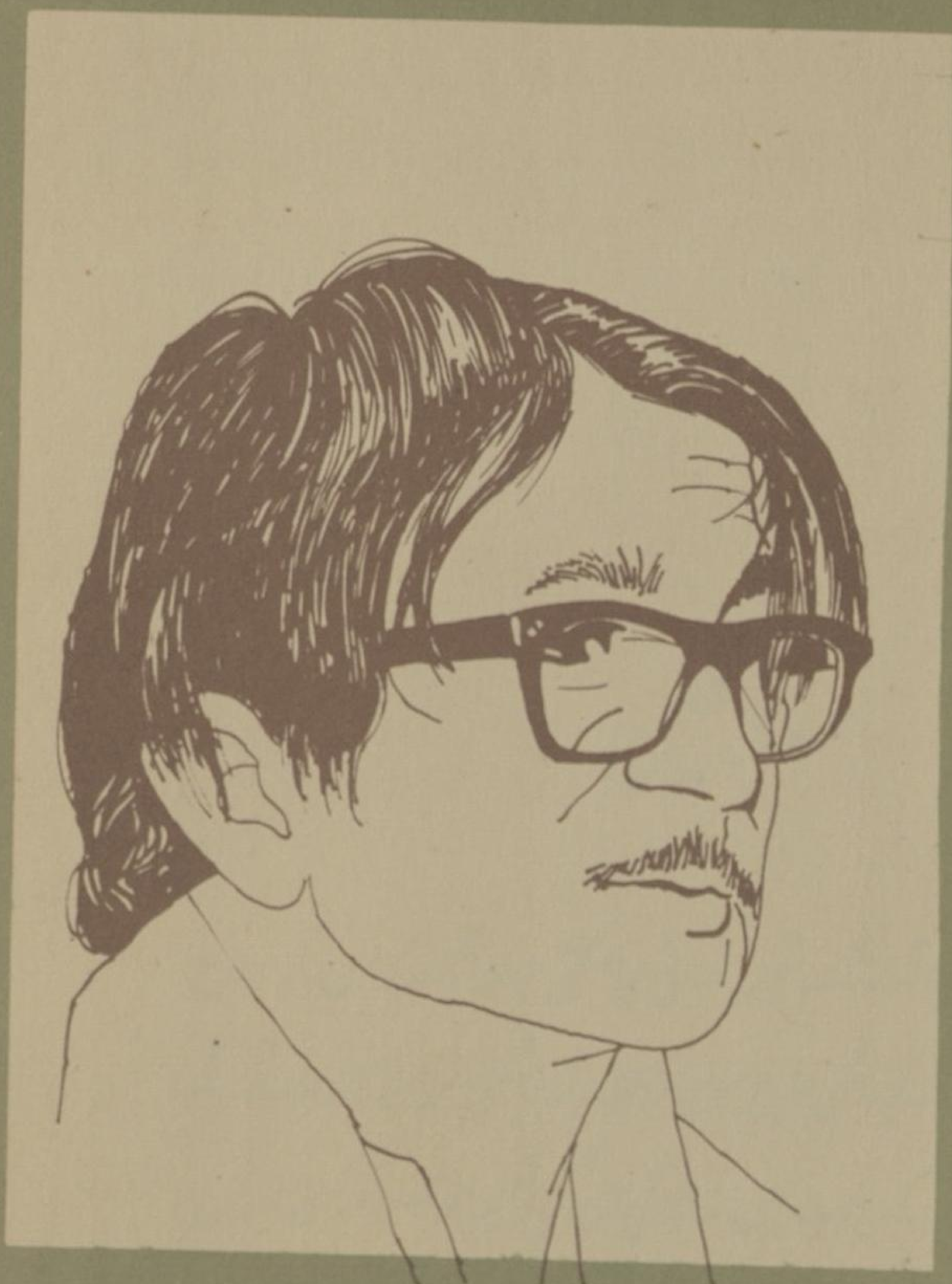
مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ مگر وہ پھر پہ اُٹھا رکھتا ہوں کیونکہ اتنے تنت وقت میں کچھ بھی تو نہیں کہا جاسکتا۔ ابھی تو میرے مضمون کو، ان کی شخصیت کے گرد ایک ہالہ ہی سمجھیں جو ان کی شخصیّت کی ضو سے، الفاظ کی صورت میں بکھر گیا ہے اگر کبھی وقت ملا تو اپنی سوچوں کو، ان کی شخصیّت کے نشیب و فراز سے ہم آہنگ بناؤں گا کیونکہ ابھی تو مجھے یہ بھی بتانا تھا کہ خدیجہ بہن میں بے نیازی اتنی ہے کہ نام و نمود کی خواہش دم توڑ چکی ہے۔ اترائیں شاید اس لیے نہیں کہ شہرت نے قدم چوم رکھے ہیں۔ وضع دار اتنی ہیں کہ دوسروں کی زیادتیوں کو بھی برداشت کرلیتی ہیں۔ صاف گو اتنی ہیں کہ بڑے بڑوں کے پتّے پانی کردیتی ہیں۔ حسّاس اتنی ہیں کہ کسی کی بھی بے بسی کو برداشت نہیں کرسکتیں۔ پُرخلوص اتنی ہیں کہ پرائے بھی اپنے بن جاتے ہیں۔

افسوس تو مجھے اس امر کا بھی رہے گا کہ میں اس برونٹی کے فن پر کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ

وہ میرا موضوع نہیں اگر میں یوں بھی قلم کو اذنِ کلام دیتا تو کچھ زیادہ مشکل پیش نہ آتی کیونکہ ان کی شخصیت سے فن کا بھی رشتہ کچھ ویسا ہی ہے جیسے ہاجرہ کا خدیجہ سے!

آسکر وائلڈ نے کہا تھا کہ عورت کے ساتھ دو رشتے ہو سکتے ہیں۔ تیسرا رشتہ نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ کہ یا تو عورت سے محبت ہو سکتی ہے یا نفرت! یورپ میں تو بے شک عورت کے ساتھ دو ہی رشتے ہوتے ہیں لیکن یہاں تو اتنے رشتے ہوتے ہیں کہ انہیں پہچاننے کے لیے یورپ کی گلیوں سے باہر نکلنا ہوگا۔ انہی رشتوں میں سے ایک رشتے کو میں نے بھی استوار کرنے کی کوشش کی ہے۔

قطع کلام! لفظوں سے کھیلنا آسان ہے۔ لفظوں کی مصوری مشکل لیکن جس نادان نے یادوں کی تصویر کشی میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہ تو بے موت مارا گیا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ بعض اوقات بے موت مرنے پر بھی راضی ہونا پڑتا ہے۔



صادقین

کسی سے بھی یاری، اُس وقت تک نہیں نبھائی جا سکتی جب تک کہ اُس کے دماغ کو اپنے دماغ میں رکھ کر سمجھا نہ جائے، اُسی طرح سوچا نہ جائے، اُسی طرح برتا نہ جائے۔ اگر یوں نہ ہوگا تو بات چیت اُس شخص کے بارے میں نہ ہوگی جو مرکزِ توجہ ہوگا، بلکہ کسی اور ہی شخص کے بارے میں ہوگی۔

اب یہ اتنا کڑا امتحان ہے کہ جس پر پورا اُترنا، نہ مجھ سے پہلے کسی کے بس میں تھا اور نہ میرے بس میں ہے۔ پہلے شخصیت نگاروں نے اِس مسئلے کو دال برابر جانا، میں نے اسے گھر کی مرغی سمجھا۔ بس اسی فرق کے ساتھ، اب میرے ساتھ چلیئے۔

حرکات و سکنات، عادات و اطوار، کرامات و انکشافات کے ذکر سے پہلے ضروری یہ ہے کہ ہم ممدوح کی سوچوں کو پکڑیں۔ اگر یوں نہ ہوگا تو اس مضمون میں صرف شخصیت کا خول نظر آئے گا۔ شخصیت کی روح نظر نہ آئے گی۔

مندرجہ بالا سوچوں سے کہیں آپ نے یہ تو نہیں سمجھ لیا کہ مَیں نے جو شخصیّت نگاری کی حدود مقرّر کی ہیں اُن پر میرا مضمون پُورا اُترے گا۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو مَیں مضمون لکھنے کی بجائے خدائی دعویٰ کیوں نہ کرتا؟

صادقین، جس کا یہ بندہ بھی نیاز مند ہے مومن نہیں کافر ہے مگر اتفاق کہ زاہدوں سے زیادہ پاک باز ہے۔ اِن سے ملنے سے پہلے مجھے اپنی پاک بازی پر جتنے بھی گھمنڈ تھے وہ سب ہیچ نظر آئے۔ کیوں کہ ہماری نیک اطواری میں خوفِ خدا کم ہے، خوفِ دنیا زیادہ ہے لیکن ان کی پاک بازی میں خوفِ خدا زیادہ، خوفِ دنیا کم ہے۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے، جس پر صادقین کی شخصیّت اور فن کا خمیر اُٹھا ہے۔

میں آج اس مضمون کے سلسلے میں میناکاری نہ کروں گا بلکہ صادقین (اور زین العابدین) کے فن کی طرح جلدی جلدی چند "لکیریں" کھینچوں گا، تصویر بن گئی تو فبہا ورنہ یہ مضمون تجریدی آرٹ کا شاہکار تو بن ہی جائے گا۔ جیسے چِت بھی اپنی ہو پٹ بھی اپنی!

دوسری جنگِ عظیم میں، اپنے صادقین صاحب جو ابھی لڑکپن کی سرحد میں تھے سیاسی شعور کی دہلیز پر آداب بجالائے۔ کٹّر قسم کے اشتراکی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ انگریزوں کے مقابلے میں ہٹلر کو پُوج رہے تھے۔ مگر یہ تھے کہ انھوں نے ہٹلر کے خلاف محاذ بنا رکھا تھا۔ امروہے کے گلی کوچوں میں ہٹلر کے خلاف، اِن کے کوئلے سے بنے ہوئے کارٹون وجہِ نزاع بنے۔ ساری خدائی ایک طرف تھی مگر میرا یہ ڈیڑھ پسلی کا بھائی ایک طرف تھا۔ اِسی پر اکتفا نہ کیا۔ ایک پمفلٹ لکھ ڈالا۔ لوگ پمفلٹ لکھنے والے کو ڈھونڈھ رہے تھے اور یہ پمفلٹ پڑھنے والوں کو، عجیب تماشا تھا۔

سُنا تو یہی ہے کہ لوگ محبوب کو ڈھونڈھنے نکلا کرتے ہیں لیکن ایک دن دیکھا کہ خود محبوب اپنے چاہنے والے کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ ایک صاحب نے آکر کہا "ایک صاحب باہر تانگے میں بیٹھے ہیں اور آپ کو بلاتے ہیں"۔ ایسے حضرات کے لیے میرا جواب عموماً یہ ہوتا ہے۔ اُن سے کہیئے تشریف لائیں ورنہ تشریف لے جائیں، مگر اُس دن مَیں کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ دیکھا تو صادقین!

"جناب باہر کیوں بیٹھے ہیں؟ اندر تشریف لائیں"۔

"اچھا پہلے مَیں ایک ضروری کام کر آؤں، اس کے بعد حاضر ہوتا ہوں"۔ جب واپس تشریف لائے تو اِدھر اُدھر کی باتوں سے پتہ چلا کہ ضروری کام کھانا کھانا تھا، حالاں کہ یہ حرکت ہمارے دفتر میں بیٹھ کر بھی ہو سکتی تھی۔

صادقین سے اِس سے پہلے بھی ملاقاتیں ہو چکی تھیں مگر وہ اتنی تشنہ تھیں، جیسے پیاسے کے لیے قطرۂ شبنم، یہی وجہ تھی کہ مَیں اِن سے لپٹ پڑا۔ "اَب کے روز ملاقات ہونی چاہیئے"۔

"ضرور ہو گی"۔

"کیسے ہو گی؟"

"میں روز آجایا کروں گا"۔

میں نے کہا "اگر آپ تشریف لایا کریں تو پانچ بجے تک، ورنہ میں چھ بجے تک حاضر ہو جایا کروں گا"۔

"ایجاب وقبول" کے بعد انھوں نے پوچھا، "پھر کیا ہوگا؟"

"پھر مَیں آپ کو دو گھنٹے کے لیے اغوا کیا کروں گا۔ کیوں کہ میرا آپ سے کچھ شُستہ اور کئی ناشُستہ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اِس خاکسار کا آپ سے باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جناب! مَیں آپ کے ہزاروں مداحوں میں سے ایک ہوں جس کا ثبوت آپ سے ملنے سے پہلے بھی دے چکا ہوں۔ وہ یوں کہ جب مجھ سے، ہمارے ایک مشترکہ دوست نے یہ کہا کہ مجھے نقوش والے محمد طفیل کے لیے، آپ کی تین چار تصویریں چاہیئں تو میں نے اُن سے کہا،" یہ بات ہے تو پھر تین چار کیوں؟ جتنی چاہیں لے لیں۔"

باتوں باتوں میں مَیں نے اُن سے پوچھا تھا۔"آپ کو اپنی کسی تصویر کا زیادہ سے زیادہ کیا معاوضہ ملا ہوگا؟" انھوں نے بتایا کہ میری تصویروں کی نمائشیں زیادہ تر غیر ممالک میں ہوئیں۔ امریکہ، فرانس اور لندن کے متعدد شہروں میں، مگر وہ زمانہ میرا ابتدائی زمانہ تھا۔ جب میرے فن کے صرف بال و پَر نکل رہے تھے۔ اُس پر مجھے فرانس میں، ایک تصویر کے تین ہزار پونڈ ملے تھے اور میری تصویر کی جو کم سے کم قیمت پڑی وہ بھی چار سو پونڈ سے کم نہ تھی۔

"واہ وا!"

"اصل واہ وا کی بات یہ ہے کہ مجھے جب بھی اور جو کچھ بھی ملا، وہ مَیں نے زیادہ تر مستحق لوگوں میں بانٹ دیا۔ روپیہ رکھنے کی چیز نہیں، بانٹنے کی چیز ہے۔ مَیں جیسے جیسے روپیہ بانٹتا گیا ویسے ویسے میرا فن امیر ہوتا گیا۔ اِس اعتبار سے آج مَیں اتنا امیر ہوں کہ قارون کے خزانے کو بھی پائے حقارت سے ٹھکرا سکتا ہوں۔"

یہ خیالات ایک بہت ہی منحنی سے شخص کے ہیں، نازک و نزار شخص کے جس کا وزن چند تولوں میں نہیں تو

چند سیروں میں ہوگا مگر جو اپنے خیالات کی اُڑان میں اتنا عظیم الجثہ ہے کہ باید و شاید! جو اپنے خلوص میں اتنا بے پایاں ہے کہ بے مروّتی منہ چھپائے پھرتی ہے۔ جو اتنا سادہ رہتا ہے کہ امارت کا ٹھسّا بھی شرمسار ہے۔ جو اپنے آپ میں اتنا مست ہے کہ پاکستان کا دیوجانس کلبی بن گیا۔

ایک دن صادقین صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ "ابھی آجائیے۔ مَیں آپ کو اپنی تازہ خطاطی دکھانا چاہتا ہوں"۔

مَیں نے کہا "حاضر ہوتا ہوں"۔

مَیں پہنچا تو میرے منتظر تھے۔ منتظر ہی نہیں بلکہ بے چین، کہنے لگے بیٹھنے سے پہلے ذرا ایک چیز دیکھ لیں۔ چنانچہ وہ چیز دیکھی۔ ایک کرُسی کے دونوں بازوؤں پر ایک آیت لکھی رکھّی تھی۔ "وتعز من تشاء وتذل من تشاء"

پوچھنے لگے "کیسی ہے؟"

مَیں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا "آپ مجھ سے خدا کے کلام کے بارے میں رائے پوچھ رہے ہیں؟"

کہنے لگے "نہیں بھئی خطّاطی کے بارے میں!"

"ماشاءاللہ"۔

"چشمِ بددور بھی تو کہو"۔

"واقعی معاملہ تو چشمِ بدُور والا ہے"۔

"یہ خطّاطی بھٹو صاحب، اندراگاندھی کو پیش کریں گے"۔

"اچھاّ!"

"جی ہاں!"

"پھر تو یہ بات سوچنے والی ہے۔ کیوں کہ حالیہ شکست کے بعد، کیا ہم اندرا گاندھی کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ذلت ہمیں خدا کی طرف سے ملی ہے یا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تجھے یہ عزت خدا کی طرف سے ملی ہے۔"

انہوں نے کہا: "میں نے اس مسئلے پر نہیں سوچا۔ میں تو صرف حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک تو اس میں نکتے کی بات اتنی ہے کہ سمجھا یا جائے کہ یہ جو کچھ ہوا، اس میں کسی کی شکست اور کسی کی فتح کا کوئی مسئلہ نہیں بلکہ قدرت کو منظور ہی ایسا تھا!"

بچپن کی یادیں سہانی ہوں یا نہ ہوں۔ مگر وہ مستقبل کی نشان دہی ضرور کرتی ہیں۔ کوئی بھی بڑا آدمی ایک دم بڑا نہیں بنتا بلکہ وہ پہلے ہی دن سے بڑا ہوتا ہے۔ بنیاد نہ ہو تو عمارت کیسی؟ اساس نہ ہو تو تکمیل کیسی؟ میرا خیال ہے کہ اب ذرا ہم بھی بچّہ بن جائیں تاکہ اس جن کو قریب سے دیکھ سکیں۔

یہ اب اپنی عمر بیالیس سال بتاتے ہیں۔ مگر یہ نہیں کہتے کہ میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو میں اپنی کورس کی کتابیں خود اپنے ہاتھ سے لکھا کرتا تھا۔ یوں ان کی کورس کی کتابیں قلمی ہوا کرتی تھیں۔ یہ سارا چسکا انفرادیت کا تھا۔ پھر اپنی پینٹہ ماری کا، اٹلس بھی خود بناتے تھے۔ جیومیٹری الجبرا کی کتابیں معہ ڈرائنگ انہی کے مشقِ ناز کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ غرض جغرافیہ کی کتابیں اور اُن کے نقشے، انہی کی رنگ کاری کی آمیزش سے پروان چڑھتے تھے۔

بچپن ہی کی "غلط تربیت" کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج بھی، ان کے انہماک کا وہی عالم ہے۔

بیٹھ گئے تو بیٹھ گئے۔ نہ دن کا پتہ، نہ شام کی خبر، بس ایک اندھیرا ہو رہا ہے ایک اُجالا ہو رہا ہے۔ نہ آرام کی فکر، نہ آسائش کا خیال۔ جہاں بیٹھ گئے، وہیں سو گئے۔ جہاں سوئے تھے وہیں سے اُٹھے۔ پھر وہی صادقین اور وہی برش کی رفاقت، اپنے جسم کو ہر ہر پہلو سے گھما پھرا کر کام کیا۔ جسم کی کھینچا تانی جیسی کبھی تھی ویسی ہی آج ہے۔

انہیں عید کا انتظار اس لیے ہوتا کہ عیدی ملے گی۔ اس سے کاغذ پنسلیں آئیں گی۔ غریبی کا مسئلہ نہ تھا۔ گھر والے مالی اعانت اس لیے نہ کرتے تھے کہ اُن کے خیال میں یہ اپنا وقت ضائع کر رہے تھے۔ انہیں زندگی میں مالی دقتیں بھی آئیں مگر ان کے کام کسی نہ کسی طرح انجام پاتے رہے۔ پیسے کی خاطر، اپنے آپ کو سُبک نہ بنایا۔ لوگ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ صادقین تنگ دست رہا لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ جینے کے لیے ہاتھ پھیلاتا رہا۔

یہ طرفہ تماشا تو شروع ہی سے تھے۔ جب بھی کوئی نقش بناتے۔ اُس میں اپنی شبیہہ کو بھی داخل کر دیتے۔ انہیں دنیا کے نقشے بنانے کا بھی ٹپکا تھا۔ نقشے بناتے تو اُس میں اپنے آپ کو بھی کہیں کھڑا کر دیتے۔ جیسے دنیا کے نقشے میں، ان کا وجود بھی ضروری ہو۔ یہ تھی تحت الشعور کی وہ رو، جس نے بعد میں جا کر انہیں صادقین بنا دیا۔ بچپن کے خواب پورے ہو کر رہے۔

یہ امروہے میں پیدا ہوئے۔ مگر اب ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ عالمی قدروں پر یقین رکھنے والا فن کار کسی ایک جگہ کا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ساری دنیا اس کا وطن ہوتا ہے۔ فرق اگر کوئی پڑتا ہے تو صرف اتنا کہ وہ کہاں پیدا ہوا کہاں پروان چڑھا۔ ان کے خیال کے مطابق چنگیز خاں نے دنیا فتح کر لی تھی مگر اُسے یہ پتہ نہ تھا کہ کچھ فاصلے پر

کون کون بادشاہ ہے۔ حکومتوں کو حکومتوں کی خبر نہ ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ فاصلے کم ہوتے گئے۔ ہر قوم کا دوسری قوم سے ربط پیدا ہو گیا۔ وہی ربط اگر مصوّری میں نہ آئے تو وہ بیجان ہے۔

پھر ان کی سوچ یہ بھی ہے کہ پہلے مصوری فرد کے گرد گھومتی تھی۔ آج افراد کے گرد، پہلے فن سلاطین کی سرپرستی میں پروان چڑھتا تھا۔ آج سلطانی جمہور کی پسند پر، جیسی مسجدیں پہلے بنتی تھیں، ویسی آج نہیں بنتیں۔ کیوں کہ وہ اب جمالیاتی سانچوں میں ڈھل کے نکلتی ہیں۔ پہلے بادشاہی مسجد بنتی تھی، وزیر خاں کی مسجد بنتی تھی۔ آج اسلام آباد کی مسجد بنتی ہے، آج مسجدِ شہداء بنتی ہے۔ یہی فرق نئی اور پرانی مصوری کا ہے۔

ایک اور موقع پر، انہوں نے قدیم اور جدید مصوّری کے فرق کو یوں بھی واضح کیا تھا جیسے پرانے زمانے کی رتھ، جو بے شک خوبصورت ہو۔ نقش و نگار سے آراستہ ہو، مینا کاری سے مزّین ہو۔ اُس میں دو بہترین بیل جُتے ہوں۔ لیکن اس کے مقابلے میں ویسے ہی پہیّوں والی آج کی کار، اب دونوں میں جو رفتار کا فرق ہے۔ وہی آج کی اور پہلے کی مصوّری کا فرق ہے۔

فنونِ لطیفہ کا اطلاق، مصوّری، شاعری اور موسیقی پر ہوتا ہے۔ اُن میں سے دو پہ اُنہوں نے چھاپہ مار رکھا ہے۔ ایک خانہ جو خالی رہ گیا تھا وہ انہوں نے خوش خطی سے بھر دیا۔ یعنی یہ اب صرف صادقین نہیں ہیں بلکہ فنونِ لطیفہ بھی ہیں۔ چوں کہ انہوں نے اپنی ذات، ان فنون کے لیے وقف کر رکھی ہے اس لیے فنون کی جیسی کھچڑی یہ پکاتے ہیں اور کوئی نہیں پکا سکتا۔ یعنی اتنی جہتوں والا فن کار اور کوئی نہیں۔

میں نے انہیں چھیڑا ”بھائی! جب میں نے ”بیاضِ غالب“ میں آپ کی تصویریں چھاپی

تھیں تو اُس وقت چند ایک آوازیں ایسی بھی اُٹھی تھیں کہ غالب کی شاعری میں قنوطیت کا عنصر سرے سے ہے ہی نہیں مگر یہ تصویریں سراسر اسی کیفیت کا اظہار ہیں۔"

ان کا جواب یہ تھا "بات یہ ہے کہ جب غالب اس دنیا میں تھے، اُس وقت مسائل ایسے اور اتنے نہ تھے۔ شہنشاہیت کا دور تھا۔ سب اچھا کہنے کا دَور، پھر اُس میں شخصی ویرانی اتنی نہ تھی۔ مگر میں نے یہ تصویریں اس دَور میں بنائی ہیں۔ میں نے آج کے زمانے کی نمائندگی کی ہے۔ غالبؔ کے اشعار کو اُس کے ماحول کے مطابق دیکھنا چاہیئے۔ میری تصویروں کو میرے ذہن اور میرے ماحول کے مطابق دیکھنا چاہیئے۔ پہلے اجتماعی شعور اتنا بیدار نہ تھا، جتنا کہ آج ہے۔ اگر میری تصویروں میں موجودہ دَور کے انسان کی ناداریوں اور اُس کی مجبوریوں کے ساتھ اس کی بے حالی اور بے کسی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بھی اپنا حق ادا کر دیا۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انیسویں صدی میں سلطانیٔ جمہور کا تصوّر محض خیال تھا لیکن آج وہ عملی صورت میں سامنے آگیا ہے۔ لہٰذا اس سے ادب بھی متاثر ہوگا اور مصوّری بھی!"

"جی ہاں! کیسے متاثر نہ ہو۔ جو شخص دنیا کے سمندر میں چھلانگ لگائے گا۔ وہ بھیگے گا ضرور!"

ایک اور موقع پر، میں نے اسی قسم کا سوال اُٹھایا تھا کہ "غالبؔ تو رجائی قسم کا شاعر تھا۔ سراسر نشاطیہ، مگر آپ کی تصویریں قنوطیت کے اسرار چھپائے ہوئے ہیں۔"

اُس موقع پر ان کا جواب مختلف تھا۔ یہاں اُسی ایک نکتہ کی تکرار اس لیے ضروری

ہے تاکہ آپ جان سکیں کہ یہ ایک ہی مسئلہ کو کتنے انداز میں سوچتے ہیں۔ خیالات کا تنوع اور تنوع ہونا ہی، ان کا خاص رُخ اور خاص وصف ہے۔ چنانچہ ان کا جواب کچھ ایسا تھا کہ "آپ نے صحیح کہا۔ مگر میرا نقطۂ نظر اور ہے کیوں کہ میں غالبؔ کے کلام کو آج کے ماحول میں جانچتا ہوں۔ آج ہم سے خوشیاں چھین لی گئی ہیں۔ آج ہم سے سکون چھین لیا گیا ہے۔ آج ہمیں تحفظِ ذات پر پہلے کا سا اعتماد نہیں رہا۔ اس لیے ہم خیالی جنّت میں کیسے رہ سکتے ہیں؟"

میں نے گزارش کی "۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ غالبؔ کے خیالات کی عکاسی نہیں کرتے بلکہ اپنے خیالات کو غالبؔ کے سر منڈھ رہے ہیں۔"

"یہ بات نہیں۔ مغرب میں آج کل یونہی سوچا جارہا ہے۔ شیکسپیئر کے ایک ڈراما کو، آج کے ادیب نے دوبارہ لکھا تو اُس کا ہیرو، اُس زمانے کا ہیرو نہیں ہے۔ بلکہ آج کے زمانے کا ہیرو ہے۔ حالانکہ ڈائیلاگ وغیرہ وہی ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنے کلاسیک کو، آج کے ماحول میں دیکھیں گے تو اُس کی صورت ضرور بدلے گی۔"

"اچھا تو صادقین صاحب! یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ نے بھی مسائل کے سمندر میں چھلانگ لگا رکھی ہے مگر اتنا اور بتادیں کہ آپ کی تصویریں ٹیڑھی میڑھی اور آڑی ترچھی کیوں ہوتی ہیں؟"

"بات یہ ہے کہ تھرڈ کلاس کے ڈبّہ میں جگہ کم ہونے کی وجہ سے مسافر سونا بھی چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے وہ گُچھا مُچھا ہی ہو کے سوئے گا۔ بالکل ویسے ہی جگہ کے اعتبار سے میری تصویریں ہوتی ہیں۔"

"آپ کی تصویریں تھرڈ کلاس میں سفر کیوں کرتی ہیں؟ فرسٹ کلاس میں سفر کیوں نہیں کرتیں تاکہ جگہ کی کمی کا مسئلہ حل ہو جائے؟"

"یہ میرے نقطۂ نظر کا معاملہ ہے۔ میں اپنا تعلق بوژوا کلاس سے جوڑنا نہیں چاہتا میرا ذہنی ربط عوام سے ہے جو لُٹے پٹے اور سوختہ سامان ہیں۔ مَیں اپنا تعلق ننانوے فیصد کی بجائے ایک فی صد سے کیسے جوڑ سکتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میری تصویریں ویسی ہی لُٹی پٹی اور ویسی ہی سوختہ سامان ہوتی ہیں جیسا کہ میرا معاشرہ اور اُس میں بسنے والے لوگ ہیں۔"

پھر صادقین صاحب ترنگ میں آگئے۔ کہنے لگے۔ "ملک ثیک اور شراب میں جو فرق ہوتا ہے۔ وہی فرق میری اور دوسروں کی مصوّری کا ہے۔"

میں نے وضاحت چاہی "کیا آپ کی تصویریں ملک ثیک ہوتی ہیں؟"

"لاحول ولا قوۃ!"

"یعنی آپ شراب کے ذکر پر بھی، مذہب سے دُور نہ رہ سکے۔"

"شراب میرا فعل ہے۔ دین میرا ایمان ہے۔"

"خُوب!"

"بات یہ ہے کہ شراب حرام ہوگئی۔ مجھے اس کی سزا ملے گی۔ مگر میں غرقِ مئے ناب اس لیے رہتا ہوں کہ مصوّری کی پری مجھ سے دُور نہ رہے۔ اب میں ہمہ وقت اس کی زُلفوں سے آسودہ ہوتا رہتا ہوں اور وہ میرے سو سو نخرے اُٹھاتی ہے۔ اگر مَیں ملک ثیک کا شوقین ہوتا تو مجھ پر یوں تصویریں نازل نہ ہوتیں۔"

"آپ کا یوں شراب پینا اور آیاتِ قرآنی کی خطاطی کرنا، میری سمجھ میں آتا نہیں!"

"آپ کی سمجھ میں آ بھی نہیں سکتا۔ مذہب میری گھٹی میں پڑا ہے اور شراب میرا فعلِ سرشاری ہے۔ مذہب کا نشہ الگ ہے۔ شراب کا نشہ الگ۔ میں ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی دامن چھڑا نہیں سکتا۔ پھر میں یوں بھی سوچتا ہوں:۔

قہّاری نہیں، رنگِ حکیمی دیکھوں
جبّاری نہیں، نقشِ رحیمی دیکھوں
چھوٹا سا کوئی گناہ کر کے مولیٰ
مَیں کیوں نہ تری شانِ کریمی دیکھوں

جہاں تک مذہب کے پاس اور اُس کے تقدّس کا معاملہ ہے۔ وہ ان کے اس واقعہ سے بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کہنے لگے کہ لاہور میوزیم کی چھت پر، میری لکھی ہوئی جو قرآن کی آیات ہیں مَیں اُنہیں اُتروانا چاہتا ہوں۔

"کیوں؟"

"اگر کبھی اس حال میں ننگی تصویروں کی نمائش ہوئی تو میرا جذبۂ ایمان مجروح ہو گا۔"

سنا صاحب آپ نے، میں نے تو اُنہیں اوروں کی طرح، مذہب سے بیگانہ، آزاد منش، سوشلزم کا پرچارک ہی جانا تھا مگر یہ اندر سے مسلمان نکل آئے۔ اس وقت مجھے وہ صادقین نظر نہ آئے جو قدرے شوخ تھے۔ یعنی جو انسانی خد و خال کو بھی آیاتِ خد و خال کہنے والے تھے۔

صادقین صاحب لوگوں کو عجیب طرح سے متاثر کرتے ہیں۔ اس میں اُن کی چالاکی

کا کم، ذہانت کا چکر زیادہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، اپنی بیاضِ صادقینی میں کہتے ہیں۔
"آج کل زندگی میں اور بالخصوص زندگی کی ہڑبونگ اور بھاگ دوڑ میں آدمی کے پاس وقت کم ہے۔ اس کے پیشِ نظر، ذیل کی سطور پر نظر ڈالنے والوں سے میری یہ التجا ہوگی کہ صرف اُس وقت، جب کوئی اور ضروری کام نہ ہو اور وقت ہی گزارنا ہو تو اِن سطور پر بھی کہیں کہیں نظر ڈالی جائے جن کی بے راہ روی اور بے ترتیبی کا مجھے خود بھی احساس ہے اور اگر گزارشِ احوالِ واقعی کے ساتھ ساتھ ان سطور میں غیر ضروری اور بے موقع باتیں بھی گھُس آئی ہیں اور بہت سی کام کی باتیں تحریر بھی نہیں ہو پائی ہیں۔ ان کو فرصت کے اوقات میں نظر سے گزارا جائے ورنہ مجھے سخت ندامت ہو گی کہ قوم کا قیمتی وقت ضائع کر رہا ہوں۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے صادقین کا بینترا کہتے ہیں کہ اگر کوئی اور ضروری کام نہ ہو اور محض وقت ہی گزارنا ہو تو میری تحریر کو پڑھا جائے۔ ورنہ یہ ہوگا کہ قوم کا وقت ضائع ہوگا۔ اس ضمن میں میری گزارش یہ ہے۔ اگر انہیں معلوم ہے کہ ان کی تحریر پڑھنے سے قوم کا وقت ضائع ہوگا تو یہ سطور لکھی ہی کیوں؟ اگر اُن کا خیال یہ ہے کہ قوم کے پاس کوئی کام نہیں۔ بیکارِ محض ہے تو بھی ان جملوں کو قرطاس پر اُتارا ہی کیوں؟ مَیں بتاؤں قصّہ کیا ہے؟ قصّہ یہ ہے کہ صادقین صاحب کو بات اپنے پیرایہ میں کرنا ہوتی ہے۔ وہ روایتی انداز اختیار کر ہی نہیں سکتے۔ بس اسی اپنے انداز نے صادقین کو صادقین بنایا اگر یوں نہ ہوتا تو یہ آج کسی ہائی سکول میں ڈرائینگ ماسٹر ہوتے۔

عموماً یہ ہوتا ہے کہ مصنّفین خود اپنی کتابیں، اپنی لاگت سے چھاپتے ہیں اور ظاہر

یہ کرتے ہیں کہ کتاب ہم نے نہیں چھاپی بلکہ فلاں ادارے نے چھاپی ہے۔ اس پر بھی صادقین طنز کرتے ہیں۔ اپنی کتاب کی پرنٹ لائن میں لکھتے ہیں "یہ خود صادقین نے اپنے گھر سبطین منزل، ناظم آباد کراچی سے اس بیاض کے قلمی نسخے کو جُوں کا توں، بے ردّ و بدل، بغیر کسی تکلّف کے شائع کیا۔"

یہ بات بے شک صاف گوئی کے ذیل میں آتی ہے۔ مگر یہاں اِن کا بیان صاف گوئی نہیں بلکہ قہقہۂ استہزائیہ ہے۔ یہ چٹکی لینے کے قائل نہیں بلکہ دانتوں سے کاٹ لینے کا عمل روا رکھتے ہیں مگر انداز ایسا ہوتا ہے کہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

مَیں نے سوچا، یہ صرف اپنی ہی بات کرتے ہیں۔ ہمہ وقت اپنی ہی ذات اور اپنے ہی فن میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ذرا ان سے کسی اور مصوّر کی بھی بات کی جائے۔ محض چھیڑنے کے لیے میں نے کہا "چغتائی صاحب نے جو اقبال کو مصوّر کیا ہے وہ مجموعہ دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کیسا ہے؟"

"خوب ہے۔"

میں نے ایسے دامن بچانے والوں کو کبھی بھی نہیں بخشا، چنانچہ کریدا "وہ مصوّری اور انداز کی ہے۔ آپ کا انداز اور ہے۔"

اس پر چہکے، "خوشبو اپنی جگہ خوشبو ہے لیکن مہک جُدا جُدا ہوتی ہے۔"

میں نے سوچا، یہ کُھل کر بات کرنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا پھر کریدا "یہ اپنی دو ٹوک

رائے دیجئے"

"میرا اور اُن کا فرق، سنار اور لوہار کا ہے"

لیجئے۔ انہوں نے بات اور اُلجھا دی۔ مَیں نے کہا" یہ بندہ موٹی عقل کا آدمی ہے لہذا اتنا اور بتا دیجئے۔ لوہار کون؟ سنار کون؟

صادقین نے دیکھا کہ یہ تو بات کو ضرور ننگی کر کے رہے گا۔ کہنے لگے"چغتائی اپنی تصویروں میں اتنی محنت کرتے ہیں کہ اُتنی محنت کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے فن کے امام ہیں۔ کوئی ثانی نہیں۔ میں اپنے خیالات کو کینوس پر اتنی جلدی منتقل کر دیتا ہوں کہ بعض اوقات مجھے بھی حیرت ہوتی ہے۔ میں اپنے کام کو لوہار کا کام اور اُن کے کام کو سنار کا کام کہتا ہوں"

"کبھی ملاقات ہوئی؟"

"جی ہاں! ہوئی۔ مَیں اخلاقی طور پر بھی ان کی بڑائی کا معترف ہوں بلکہ مدّاح ہوں۔ وہ بڑے فراخ حوصلہ ہیں۔ میری اُن کی ملاقات لاہور میوزیم میں ہوئی تھی۔ جبکہ وہاں میری تصویروں کی نمائش تھی۔ زبانی بھی میری حوصلہ افزائی فرمائی پھر توصیفی کلمات سے پُر چھ صفحوں کا ایک خط بھی لکھا۔ اس بات سے میرے دل میں اُن کی عظمت اور بھی بڑھ گئی۔ مصوّر کی حیثیت سے جو اُن کا مرتبہ ہے وہ میری توصیف کا محتاج نہیں"۔

میں نے اس مسئلے کو یہیں چھوڑا۔ ایک اور بات چھیڑ دی، آپ نے کس سے کسبِ فیض کیا؟

"آپ کی مراد اُستاد سے ہے؟"

"جی ہاں"!

"بتا دوں؟"

" ہاں ہاں!"

"بات یہ ہے کہ میں اپنا شاگرد بھی خود ہوں اور اپنا اُستاد بھی خود!"

" واہ وا اُستاد کی مار سے بھی بچ گئے۔ شاگرد کی پچھاڑ سے بچ گئے۔ اس خوشی میں اتنا اور بتا دیجئے آپ کے پاس اپنی بنی ہوئی کتنی تصویریں ہوں گی؟"

"تھوڑی سی ہیں۔"

"بنائی تو ہزاروں ہوں گی"۔

"جی ہاں! مگر اب وہ دنیا بھر میں بکھر چکی ہیں۔ کوئی کسی ملک میں کوئی کسی ملک میں!"

"آپ کے پاس ان کا کوئی ریکارڈ ہے؟"

"نہیں!"

"یہ تو ظلم ہوا۔ اس لیے کہ اب کوئی آپ کے فن کو یکجا صورت میں نہ دیکھ سکیگا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ میں منتظم قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ مگر ڈھونڈنے والے میری تصویروں کو ڈھونڈ ہی لیں گے۔"

اعتماد ہو تو ایسا، اس کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ پورے طور پر اب انہیں ڈھونڈھنا یہ مشکل مصوری، مشکل ہی ہوگا۔ مگر ان کا اعتماد بھی اپنی جگہ کم توجہ آمیز نہیں۔ کہتے ہیں کہ میری ذات نہیں تو میرا فن، آئندہ نسلوں کے لیے امانت ہے۔

ایک دن صادقین صاحب نے مجھے بلایا کہ "آج گھر جانے سے پہلے مجھ سے مل کر جائیں۔ آپ سے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔ میں عموماً کئی لوگوں کو "غچہ" دے جاتا

ہوں مگر صادقین کے سلسلے میں بہت مخلص ہوں۔ کیوں کہ مجھے ان سے باتیں کرکے، ان کے پاس بیٹھ کر، ایک قسم کا تحیّر آمیز سکون ملتا ہے۔ چنانچہ پہنچا اور پوچھا "خیر باشد؟"

"میں اپنی تصویروں کی نمائش کرنا چاہتا ہوں۔"

"اِن دنوں؟"

"ہاں!"

"بھئی مشرقی پاکستان میں جنگ زوروں پر ہے۔ ایک آدھ روز میں اِدھر بھی چھڑا ہی چاہتی ہے۔ لہٰذا ــــ"

"بات یہ ہے کہ ان دنوں خطاطی کی نمائش تو چل ہی رہی ہے۔ غالبؔ کی تصویروں کی نمائش بھی ہو جائے۔"

"میرا مشورہ یہ تھا کہ چند دنوں تک توقف کرنا، سودمند ہی ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اِدھر نمائش ہو اُدھر جنگ چھڑ جائے۔"

کہنے لگے "کارڈ چھپ گئے ہیں۔ دوسرے جو کچھ ہونا ہے وہ ہوتا رہے گا ہمیں کیا! ہمیں تو اپنے کام سے غرض رکھنی چاہیئے۔ یعنی جو کچھ کر رہے ہیں۔ اُس میں جنگ تک کو حائل نہیں ہونا چاہیئے۔"

میں نے کہا "آپ کا جذبہ اپنی جگہ درست، مگر جنگ میں باہر کون نکلے گا؟"

کہنے لگے "اگر کسی کو ہمارے فن سے عشق ہے تو وہ گولیوں کی بوچھار میں بھی پہنچے گا۔ ایسی صورت میں اگر ایک آدمی بھی گھر سے نکل پڑا تو وہ ہزاروں پہ بھاری ہوگا۔"

چنانچہ صاحب! ہم نے دیکھا کہ اُدھر توپ کے گولے، زمین ہلائے دے رہے تھے۔ اِدھر ان کی تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی۔ پھر وہاں ایک آدمی نہ تھا سینکڑوں آدمی تھے۔ پھر اُس نمائش کا کوئی مہمان خصوصی نہ تھا۔ فیتہ کاٹنے والا کوئی نہ تھا۔ معلوم ہُوا انہوں نے کبھی بھی کسی بڑے آدمی سے اپنی تصویروں کی نمائش کا افتتاح نہیں کرایا۔ ان کے نزدیک کوئی کسی سے افضل نہیں، کوئی کسی سے کمتر نہیں۔ بلکہ کسی لکھ پتی کو اپنی نمائش میں دیکھ کر اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا کہ انہیں، جو ان کی تصویروں کا موضوع ہیں۔

اُسی نمائش میں ایک صاحب نے اپنے پائپ کا دھواں چھوڑتے ہوئے ان سے پوچھا تھا۔ جناب! یہ تو بتائیں کہ آپ کی تصویروں میں کٹے ہوئے سر کیوں نظر آتے ہیں؟"

ان کا جواب یہ تھا کہ "ایک غیور لیکن غریب آدمی اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ لیکن آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا۔"

وہ صاحب امیرانہ ہنسی ہنسے، مگر زبان سے یہ کہا۔ "ہمیں بھی سمجھا دیجئے۔"

اُس وقت مسکرائے تو صادقین بھی مگر ان کی مسکراہٹ کٹیلی تھی۔ پھر گویا ہوئے "پہلی بات تو یہ کہ کٹے ہوئے سر نہ کہیں بلکہ یہ کہیں کہ سر ہتھیلی پر رکھے ہوئے کیوں نظر آتے ہیں؟"

"چلئے یہی سہی!"

"قصّہ یہ ہے کہ اخلاقی جدوجہد میں بکھرے ہوئے تار و پود کو سمیٹنے کے سلسلے میں یعنی اجتماعی شعور کو بیدار کرنے کے سلسلے میں سر کو ہتھیلی پر ہی رکھنا ہوگا۔ ورنہ آپ اپنے

مشن میں کامیاب نہ ہوں گے ۔"

وہ صاحب پھر گویا ہوئے "آپ بہت بڑی بڑی تصویریں بناتے ہیں۔میں نے آپ کا کوئی چھوٹا کام نہیں دیکھا۔"

نہ جانے پوچھنے والے کا مدعا کیا تھا۔مگر یہ ٹھٹھول آمیز منطقی جواب کے موڈ میں آگئے۔ کہنے لگے "اگر لباس ڈھیلا ہو تو کاٹ کر اس کو موزوں کیا جاسکتا ہے۔لیکن اگر لباس جسم سے چھوٹا ہو تو اس صورت میں جسم کی تراش خراش مشکل ہوگی۔"

وہ صاحب جھینپے۔انہوں نے تجاہلِ عارفانہ سے گریز کیا اور کہا "اور سنیئے! میں کلائی اور بازو سے کام کرنے کا عادی ہوں۔یعنی جغرافیائی اعتبار سے طویل و عریض کام کرنے کا مزاج ہے۔"

اس گفتگو کے بعد، انہوں نے اُدھر، انہی صاحب کو سر سے پیر تک دیکھا! دھر ہمیں کہا "آؤ یار چائے پیئیں۔تاکہ موضوع بدلے۔"

جب چائے پینے لگے تو میں نے صادقین کی خواہش کے مطابق سوچا۔موضوع بھی بدلنا چاہیئے۔چنانچہ از رہِ تفریح پوچھا "آپ کے کتنے بچّے ہیں؟"

صادقین لہک اُٹھے "ابھی تک بچّوں کی ماں ہی کا کوئی وجود نہیں۔"

"بہت خُوب!"

"اس موقع پر لفظِ خُوب کا استعمال خُوب ہے۔"

"میں تو اس موقع پر سبحان اللہ کہنا چاہتا تھا۔مگر بہت خُوب پر ہی اکتفا کر لیا۔"

"اگر آپ سبحان اللہ کہتے تو یہ شرعی مسئلہ بن جاتا۔"

"اگر مَیں الحمدللہ کہتا تو ؟"

"موقع تو یہی تھا۔ اس لیے کہ اگر میں شادی کے چکّر میں پڑ جاتا تو میں اپنے فن کے ساتھ انصاف نہ کر سکتا۔ اس لیے کہ میرے لیے جو کچھ ہے۔ میرا فن ہی ہے۔ یہی میرا دین، یہی میرا ایمان ہے۔ یوں میرے فن نے بھی میرا اتنا ساتھ دیا ہے کہ مجھے دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز کر دیا۔ اور کیا چاہیئے"۔

جیسی لگن ان کی مصوّری سے ہے ویسی ہی کمزوری خطّاطی بنتی جا رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جیسی خطّاطی ہارون الرشید کے زمانہ میں ہوتی تھی۔ ویسی خطّاطی آج کے زمانہ میں وجہِ افتخار نہیں بن سکتی۔ کیونکہ دنیا آگے نکل گئی ہے۔ اُٹھنے بیٹھنے کا طریقہ بدل گیا ہے۔ سوچ کا انداز بدل گیا ہے۔ پہلے جہاں دو دو تین تین منزلیں ہوا کرتی تھیں وہاں آٹھ آٹھ دس دس منزلوں کی عمارتیں ہیں۔ لفٹیں لگی ہوئی ہیں۔ اُس بغداد اور آج کے بغداد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پھر خطّاطی یا مصوّری کیوں نہ بدلے۔

میں نے صادقین سے پوچھا "کیا آپ نے خطّاطی کے بارے میں کسی سے مشورہ کیا یا یہ بھی از قسمِ مصوّری، اختراع ہی ہے ؟"

"فن شعوری کوشش سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ ڈھیل میں ملتا ہے"۔

"پھر بھی ہر فن کے کچھ اصول اور ضابطے ہوتے ہیں جن کا جاننا ضروری ہوتا ہے"۔

"یہ ٹھیک ہے کہ کچھ اصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔ مگر وہ ضابطے بناتا کون ہے؟ کوئی مجھ سا ہی انسان! جس کا ایک دماغ، دو آنکھیں اور دو کان ہوتے ہیں۔ یا اُس میں کوئی الگ سرخاب کا پَر لگا ہوتا ہے ؟"

"اچھا یہ بتائیں، پچھلے دنوں جو آپ نے سورۂ یٰسین کی خطّاطی کی تھی۔ وہ آپ

نے صاحبانِ فن کو بھی دکھائی تھی۔ دکھائی تھی تو ان کا ردِعمل کیا تھا؟

"یہ نہ پوچھیں"۔

"کیوں؟"

"اُن لوگوں میں ذرا بھی رواداری نہیں۔ چھوٹوں بھی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے بمثال کے طور پر اگر میں محمّد علی کلے کو اس چھٹانک بھر جان کے ساتھ گھونسہ مار دوں تو وہ بھی ایک بار ہنس کے کہے گا "خوب لگایا"۔

"آخر آپ نے فنِ خطّاطی سے کس قدر انحراف کیا ہے جو خوش نویس حضرات آپ سے ناراض ہو گئے؟"

"بات یہ ہے کہ پہلے سلاطین کا زمانہ تھا۔ جگہ کے لیے لڑائی ہوتی تھی، ذاتی عشرتوں کے لیے لڑائی ہوتی تھی۔ دشمن کو پنجرے میں بند کر کے لایا جاتا تھا۔ اپنا زمانہ مختلف ہے۔ خیالات شہنشاہیت کے خلاف ہیں۔ اب شہنشاہیت نسخۂ کارگر نہیں۔ آج فرد کی اہمیت کا نہیں جماعت کی اہمیت کا زمانہ ہے۔ سلطانیٔ جمہور کا، جمہور میں ربط ہونا ہے۔ ایک دوسرے سے تعلق ہوتا ہے۔ پہلے ایک لفظ کی اقلیم میں شوشہ تک داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنی خطّاطی ایک لفظ کو، دوسرے لفظ کے پہلو میں جتنی جگہ دے سکتی ہے دیتی ہے۔ اپنے دائروں میں ایک دوسرے کے لیے، دل میں جگہ ہوتی ہے۔ اس لیے کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ الفاظ آجاتے ہیں۔ جملہ دائروں کا آپس میں رشتہ ہونے کی وجہ سے، ایک ڈیزائن بن جاتا ہے۔ عبارت کی وحدتِ مجموعی اور اس کی خوبصورتی بے انتہا ہے"۔

صادقین صاحب! آپ نے ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہہ ڈالیں۔

میں نے ٹوکا اس لیے نہیں کہ کہیں "جماعت سے ربط" منقطع نہ ہو جائے۔ جہاں تک فرد سے افراد والی بات ہے وہ تو ٹھیک ہے۔ پہلے تقاضے اور تھے آج کے تقاضے اور ہیں۔ مگر یہاں تو مسئلہ فن کا ہے۔ جس کے کچھ اصول اور ضابطے ہیں۔"

"حضرت! فن پر ضابطوں کے خول نہیں چڑھانے چاہئیں۔ فن کار کو فضائے نیلگوں میں آزاد ہونا چاہیے جیسے دریا کا بہاؤ، دریا آزاد ہوتا ہے، ٹیڑھا میڑھا چلتا ہے۔ جہاں میدان ہوتا ہے وہاں پھیل جاتا ہے۔ جہاں اُسے تنگ پہاڑوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہاں چوڑائی کم ہو جاتی ہے مگر اس کا عمل نہیں رُکتا۔"

میں نے گزارش کی "کہیں آپ ربط اور ضبط کی بات کرتے ہیں۔ کہیں آپ اپنے اُوپر کسی قسم کی بھی ربطگی اور ضبطگی کے قائل نہیں۔ چوں کہ میرا منصب آپ سے بحث کرنا نہیں بلکہ خیالات تک رسائی حاصل کرنا ہے اس لیے آپ یہ بھی بتا دیجئے کہ آپ نے خطّاطی میں جو کچھ بھی اختراع کی اُس کی حدود آخر ہیں کیا؟"

"اگر آپ مجھ سے منطقی انداز میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو بندہ اس کے لیے بھی تیّار ہے۔ چونکہ آپ نے مجھ سے پُوچھا ہے کہ میں خطّاطی میں کن امور کا خیال رکھتا ہوں تو وہ سُن لیجئے۔ ذرا پہلے چائے ہو جائے!"

"اجی چھوڑیئے۔ میرا جی نہیں چاہتا۔"

"میرا تو چاہتا ہے۔"

"پھر آپ نے مجھ سے کیوں پوچھا؟"

"اخلاقاً!"

"جیسے باغیانہ خیالات ان کے ہیں۔ اُن کی موجودگی میں تو ان کا اخلاق وخلاق سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے مگر ہے۔ قدم قدم پر ہے۔ کوئی ملنے جائے گا تو اُسے باہر تک رخصت کرنے آئیں گے۔ حتی الامکان کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ ساتھ چلیں گے تو مرفتاً خود پیچھے پیچھے چلیں گے۔ نہایت مہذب انداز میں گفتگو کریں گے۔ آپ برہم بھی ہو جائیں گے تو مسکراتے رہیں گے۔ بار بار چائے خود بھی پیئں گے، آپ کو بھی پلائیں گے۔ مگر وہ مجھ جیسے کم سوادوں سے صرف پینے کے سلسلے میں اصرار نہ کریں گے۔ باقی ہر بات پر اصرار ہوگا۔

ہاں تو میں نے پُوچھا کہ آپ نے خطّاطی کے سلسلے میں کیا کچھ اختراعات کر ڈالیں، اور وہ بتا رہے تھے کہ" میں اگر لفظ "ج" ایک جگہ پر ایک طرح سے لکھوں گا تو دوسری جگہ، دوسری طرز پر لکھوں گا۔ ہزار جگہ لفظ "ج" لکھوں گا تو اُسے ہزار ہی انداز سے لکھوں گا۔ کیوں کہ میرے نزدیک یکسانیت فن کی تباہی کا نام ہے۔ اللہ نے بھی دو پتّے یکساں نہیں بنائے۔ چہرے یکساں نہیں بنائے۔ کروڑوں آدمیوں کے چہرے ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بھی فضلائے قرطاس پر بیکراں ہونا چاہتا ہوں"۔

"ہو جائیے"۔

اس پر ہنسنے لگے۔ مگر سلسلہ جاری رکھا۔" لفظوں کے باہر یا ارد گرد جو جگہ بچتی ہے وہ بڑی اہم ہے۔ مَیں صرف لفظ کی ساخت ہی کو نہیں دیکھتا بلکہ ارد گرد والی جگہ بھی میرے نزدیک اتنی ہی اہم ہے۔ میرے ہاں لفظ جگہ کی طرف بڑھتے ہیں اور جگہ لفظ کی طرف۔ اور پھر دونوں یوں بغل گیر ہوتے ہیں جیسے ایک دوسرے میں پیوست ہوں۔ اپنا قانون

یہ ہے کہ جو کچھ نظر آئے وہ نظر نواز ہو"۔

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ آپ فنون کے وزیرِ قانون ہیں"۔

"آپ نے ہمیں محدود کر دیا۔ ورنہ اپنا رُتبہ تو خالق کا ہے"۔

"آپ خالق بنیں یا کچھ اور، خوش نویس تو آپ کی موجودہ اختراعات کو بدعت ہی کہیں گے۔"

"آپ کو معلوم نہیں شاید کہ انہوں نے مجھ بیکس و تنہا پر ایک حملۂ اجتماعی کیا تھا"؟

"مجھے نہیں معلوم!"

"قصّہ یہ ہوا کہ میں نے دس انچ چوڑائی کے ۲۶۰ فٹ لمبے لکڑی کے تختے بنوائے اور اُن پر عجائب گھر کیلئے سورۂ یٰسین لکھ دی۔ جب وہ مکمل ہو گئی تو میں نے لاہور کے چیدہ چیدہ خوشنویسوں کو بُلایا تاکہ ان کی رائے معلوم کی جا سکے۔ وہ تشریف لائے تو برہم ہو گئے۔ ان کے تیور غضب ناک تھے۔ انہوں نے صرف ہاتھوں اور لاتوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ یہ سراسر بدعت ہے جو قابلِ گردن زدنی ہے"۔

"آخر وہ اتنے ناراض کیوں ہوئے؟"

"اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے انہیں یہ وہم ہوا ہو کہ میں نے میوزیم والوں سے کوئی بڑی رقم اینٹھی ہو اور یوں اُن کا حق مارا گیا ہو۔ حالاں کہ یہاں تو قصّہ یہ ہے کہ رنگ بھی فقیروں کا ہے۔ چوں کہ چار پشتوں سے ہمارے ہاں بزرگوں کے لکھے ہوئے قرآن مجید تھے۔ اس لیے ہمارے خون نے بھی جوش مارا اور یہ ہمّت کر ڈالی۔ اس سے پہلے ہم نے سورۂ رحمٰن کو مصوّری مع خطّاطی کے روپ میں پیش کیا تھا۔ جسے سب نے پسند کیا تھا۔ اب جو ہم نے صرف خطّاطی کی تو وہ فن کاروں کے موجودہ گروہ کو پسند

نہیں آئی۔ اس پر میں نے ایک رباعی کہی ہے "۔

" رباعی ؟"

" ہاں! قصّہ یہ ہے کہ مجھے اپنے فن یا اپنی ذات کے بارے میں جو کہنا ہوتا ہے، اُسے میں نے رباعیات کے رُوپ میں کہہ دیا ہے۔ میرے فن یا میری ذات کی تفسیر میری رباعیات بھی ہیں "۔

" فرمایئے پھر۔"

میں نے کہا تھا :

لکھتا ہوں کبھی کبھی ہمیشہ تو نہیں
میرا قلم مزدور کا تیشہ تو نہیں
بے وجہ ہیں خوشنویس مجھ سے ناراض
خطّاطی مرا شوق ہے پیشہ تو نہیں

دوسرے میں اپنے فن کو کسی فرد کی ملکیّت بنانے کی بجائے یہ چاہتا ہوں کہ اُسے وقف العوام بنایا جائے۔ مَیں نے غالبؔ سے متعلق بنی ہوئی تصویریں غالب اکیڈیمی کو دیدیں بلامعاوضہ دے دیں۔ مَیں نے سورۂ یٰسین لکھی۔ لاہور میوزیم کو دے دی۔ بلامعاوضہ دے دی۔ مَیں اپنا سارا دوسرا کام بھی کسی عوامی ادارہ کو بلامعاوضہ ہی دے دوں گا۔ سورۂ یٰسین لکھنے میں اپنی خواہش کا عمل دخل صرف اتنا ہے کہ میں چاہتا تھا کہ اسلامی گیلری میں، ایرانی قالینوں، مغلیہ اگالدانوں اور ملکہ نورجہاں کے جھمکوں کے ساتھ کوئی فن پارہ ایسا بھی ہو جسے اسلام سے بھی کوئی نسبت ہو "۔

ان کی سوچیں اپنی ہیں۔ جن میں انفرادیت ہے۔ نہ صرف انفرادیت بلکہ جان بھی، ان کے نزدیک ہر چیز میں ایک قدر مشترک ہے۔ مثال کے طور پر وہ لفظ "ن" لکھتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور "ن" لکھ دیں گے۔ پھر وہ ان نونوں کو مرکز بنا کر، ان کے اِردگرد عورت کی تصویر بنانا شروع کر دیں گے اور اُن دو نونوں کو پستانوں کا روپ بخش دیں گے۔ کہیں دو نونوں کو الگ الگ لکھ کر، ان کے گرد لائنیں لگا کر، انہیں جام وسبو کا روپ بخش دیں گے۔ کہیں دو نونوں کو مرکز بنا کر ان کے اِردگرد لائن لگا کر دو رڈیاں بنا دیں گے اور کہیں دو درخت، یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک ہر چیز میں قدرِ مشترک ہے۔ خواہ وہ بادل ہوں، میز ہو، عورت ہو جیسے :-

اک شوخ کو سامنے بٹھایا میں نے
ج، س لکھا ن بنایا میں نے
ابجد کے پیچ و خم و خطوطِ تن میں
اک عنصرِ مشترک کو پایا میں نے

میں نے ان سے ایک دن پوچھا "آرٹسٹ ننگی تصویریں کیوں بناتے ہیں؟" انہوں نے کہا "مجھے اوروں کا علم نہیں۔ اپنی کہتا ہوں کہ میں ننگے اجسام کو بھی پاک و پاکیزہ سمجھتا ہوں۔ اگر یوں نہ سمجھا جائے تو یہ خدا کی بھی توہین ہے کیوں کہ وہ بھی اپنے بندے کو ننگا پیدا کرتا ہے۔ سنو!"

زہاد حسینوں کو بُرا کہتے ہیں — درویش سلام اور دُعا کہتے ہیں
جس موقع پر لاحول پڑھتے ہیں زاہد — اس موقع پر ہم صلِّ علیٰ کہتے ہیں

یہ صادقین ہیں۔ اس لیے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے اِن کے ڈھنگ بھی نرالے ہیں۔ لوگ مشرق کی جانب جا رہے ہوں گے تو اِن کا رُخ مغرب کی جانب ہو گا۔ لوگ زبان سے بولتے اور کانوں سے سُنتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہو گی کہ "کاش میں آنکھوں سے باتیں کر سکتا اور کانوں سے دیکھ سکتا"

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنے قصیدے سننے کے لیے محفلیں منعقد کراتے ہیں۔ یہ خاص طور پر اپنے خلاف کہلوانے کے لیے، لوگوں کو اکٹھا کرتے ہیں۔ اور دعوتی کارڈوں پر اس طرح کا مضمون باندھتے ہیں :-

" فقیر صادقین سرِ مقتل ! —— بنام خدائے بخشندہ مہربان،

بروز جمعرات بتاریخ ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۳ء بوقت ۴ر بجے شام، بہ مقام پاکستان نیشنل سنٹر الفلاح بلڈنگ لاہور۔ مسلکِ سرمدی کا مشعلچی، بجز دو حرفِ "لااله" اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھنے والا، اعتراضوں کے بھالوں کی بوریوں کی چھاؤں میں، تنقیص کے کلہاڑوں کے توس کی زد پر، سُوءِ ظن کی چھُریوں کے بھپکوں کے سائے میں، تنقید کی برچھیوں کی آب کے زاویوں پر اور غلط فہمی کی سنگینوں کی گرم نوکوں کے سامنے اپنی آنکھیں کھولے ہوئے، چوراہے کے بیچوں بیچ ہُو حق ہُو حق، کرتا ہوا، لبادہ ظاہری کی قید و رسم سے آزاد، زیر لب مسکراتا ہوا، نظامِ زرپرستی سے جہاد کرتا ہوا اور تحسین کے گلدستوں سے بے نیاز۔

فقیر صادقین سرِ مقتل !

اس موقع پر سنگ و دشنام اور خنجرِ اعتراض لانے والوں کو بطورِ خاص دعوتِ پُر خلوص ہے ——— شہریاروں کا رقیب، مسکین و غریب، آیات کا کاتب، بندۂ مرزا اسداللہ خاں غالب، دنیاوی طریقے سے کنگال، روحانی طور پر مالامال، مضطر، بیکل، بے چین، فقیر صادقین اپنی خطاطی کا نقطۂ نظر اور تجربہ آپ کے سامنے برسبیلِ تذکرہ کے انداز میں پیش کر کے اپنی فن کارانہ شریعت اور خطاطانہ طریقت کی وضاحت کر دینے کے فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہے۔ اس کی کچھ خطاطیاں بھی وہاں آویزاں ملیں گی اور کچھ خطاطیاں نقطۂ نظر کی مزید توضیح کے لیے ممکن ہے کہ وہ موقع پر کر کے بھی دکھا دے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ فنِ خطاطی کے تجربے سے متعلق کچھ رباعیاں بھی چلتے چلتے پیش کر دے!"

دیکھا صاحب آپ نے کہ انہوں نے پبلک کو کیسا چکر دے رکھا ہے؟ پھر یہ بھی دیکھئے کہ یہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کتنے پینتروں سے کر سکتے ہیں؟ علاوہ ازیں اپنی توصیف میں بھی کیا کچھ نہیں کہہ سکتے؟ اس کے باوجود یہ حضرت فقیر کے فقیر ہیں۔ غرض یہ حضرت مسلّمات کی نفی ہیں۔ بلکہ مسلّمات کی صادقین ہیں۔

میں پچھلے برس کراچی گیا تو معلوم ہوا صادقین ہسپتال میں ہیں۔ تشویش ہوئی۔ اِدھر اُدھر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ جناح ہسپتال کے کمرہ نمبر ۳۴ میں ہیں۔ چنانچہ پہنچا۔ دیکھا تو کمرہ خالی۔ صادقین ندارد، پوچھنے پر علم ہوا کہ وہ صبح ہی سے غائب ہیں۔ اُن کی "غائبیت" سے یہ اطمینان تو ہوا کہ معاملہ نازک نہیں۔ ایک چٹ لکھ کر چھوڑ آیا کہ کل رات کو پھر حاضر ہونگا دوبارہ پہنچا تو پائے گئے۔

کہنے لگے۔ "یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"لوگ کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے والے کو خُدا ملے یا نہ ملے۔ اس کا بندہ ضرور ملتا ہے"۔

"سچ ہے۔ طلبِ صادق ہونی چاہیئے"۔

"جناب یہاں تو طلبِ صادق ہی نہیں، طلبِ صادقین تھی"۔

"پھر بھلا کیسے نہ ملتا!"

"یہاں کیسے آ گئے؟"

"محض تفریحاً، پچھلے دنوں میرے بھائی کاظمین کا انتقال ہو گیا تھا پہلے ان کی بیماری کی وجہ سے بے چین رہا۔ سونا نصیب نہ ہوا۔ پھر اس حادثہ کی وجہ سے اعصاب جھنجھنا کے رہ گئے۔ جب نڈھال ہو گیا تو یہاں چلا آیا تاکہ اعصاب کو سکون نصیب ہو۔ لہذا ایک ہفتہ سے یہاں ہوں"۔

"لاہور کے دن یاد آتے ہیں؟"

"ہاں بھئی لاہور کے کیا کہنے۔ وہ تو علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ فنِ مصوّری کے جیّد فن کار موجود! فنِ خطاطی کے بھی نامور آرٹسٹ موجود! اُن دنوں تخلیق اور اختراع کے

رشتے خوب استوار تھے ۔ میں تو لاہور کو اپنا مستقل مسکن بنانا چاہتا ہوں تاکہ میرا پھر سے تخلیق اور اختراع سے رشتہ جڑے ۔"

"آپ نے کئی اہم کام کراچی میں بیٹھ کر بھی کیے ہیں ۔"

" یہ صحیح ہے ۔ اگر وہی کام میں لاہور میں بیٹھ کر کرتا تو وہ فن کی بلندیوں سے اور بھی زیادہ قریب ہوتے ۔ کراچی سرمایہ داروں کا شہر ہے ۔ فن کاروں کا شہر لاہور ہے ۔"

"آپ جس زمانے میں لاہور میں تھے ، اُن دنوں وہاں جنگ بھی موجود تھی ۔ یعنی دو صدمے لاہور کو سہنے پڑے ۔"

" واہ وا یہاں صدمے کا لفظ آپ نے خوب جڑا ۔ ویسے یہ ہے کہ وہاں کی فضا نے مجھے خوف زدہ نہیں ہونے دیا تھا بلکہ دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی ۔ ہوائی جہازوں کی کھڑکھڑاہٹ اور توپوں کی دھمک نے میرا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا ۔ بلکہ جی چاہتا تھا کہ گولیوں کی بوچھار میں بھی ، ہمیں اپنا رول ادا کرنا چاہیئے ۔

" جی ہاں اُن دنوں آپ بڑی موج میں تھے ۔"

" بالکل موج میں تھا ۔ انہی دنوں میں نے اپنی زندگی کا نیا تجربہ کیا تھا یعنی پنجابی زبان میں شاعری کی ۔"

" ہاں صاحب کی !"

"اب دیکھو مجھے زبان کہاں آتی تھی ۔ وہ جو میں نے کہا تھا کہ وہاں تخلیق کے رشتے استوار ہو رہے تھے ۔ وہ کسی بنیاد پر کہا تھا ۔ اُسی کی بدولت میں نے پنجابی زبان میں بیسیوں ہی رباعیاں کہہ ڈالی تھیں ۔

"خوب یاد ہے۔"

"بھئی وہ رباعیاں کیسی تھیں، کوئی بات بنی تھی کہ نہیں؟ مجھے تو سب یہی کہتے تھے کہ خُوب ہیں۔ مگر سچّی بات ہے کیا؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کا اس زبان سے ناواقف ہونا، پھر اس کے لہجے اور تیوروں سے ناواقف ہونا، اس کے باوجود اچھے خاصے شعر کہہ جانا میرے نزدیک تو بڑا واقعہ ہے اور یہ واقعہ اُن واقعات سے قطعی مختلف ہے کہ جیسے کوریا کا وفد آئے اور وہ "سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے" گا کر چلا جائے یا ترکی کا وفد آئے اور وہ "دمادم مست قلندر" گا کر چلا جائے۔ میرے نزدیک تو آپ کا یہ اکتسابِ زبانِ غیر کا واقعہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ موڈ میں ہوں تو دو چار رباعیاں سُنا دیں۔"

"عرض کرتا ہوں مگر اُردو ہی لہجے میں پنجابی زبان سُننی پڑے گی۔"

"جی یہ ستم تو آپ پہلے بھی کر چکے ہیں۔ ایک بار اور سہی!"

"ہاں ہاں آپ تو پہلے ہی سے قتیلِ لہجہ ہیں۔ آپ کو معلوم ہے نا کہ اُن دنوں جنگ ہو رہی تھی۔ اس لیے اُس ماحول سے متاثر ہو کر میں نے کہا تھا:

ئنیاں مَیں کتے ہور چلا جاواں گا
دشمن دے حملے توں وی بچ جاواں گا
پر جاواں تے ایتھو وی مٹیاراں نوں
فر کنج میں منہ آن کے دکھلاواں گا

مَیں نے کہا: "بڑی اچھی گل کیتی اے تُساں!"

"ہاں بھئی یہ ٹھیک ہے کہ آپ مجھے، پنجابی شاعری کے بارے میں پنجابی زبان "وچ" رائے دیں۔ ایک اور رباعی میں نے جنگ ہی سے متاثر ہو کر کہی تھی۔ وہ بھی سُن لیں :۔

بمب سُٹنے لئی ویری سی آیا ہویا
سی کول مرے ریڈیو لایا ہویا
مَیں خبراں سنن بیٹھا سی، پر اکھاں وچ
سی ساتولا مکھڑا ترا چھایا ہویا

"پنجابی زبان میں جتنا کچھ کہا، کیا وہ صرف جنگ سے متعلق ہے۔ کچھ غمِ جاناں کا بھی قصّہ ہے کہ نہیں؟"

"ایک مصوّر اپنے ازلی موضوع کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ پہلے جو میں نے دو رباعیاں سنائی ہیں۔ وہ تو اُس وقت کے ماحول میں جو ترنگ کی کیفیت تھی اور جو اُن کا روّیہ تھا۔ اس کے اظہار میں کہی تھیں۔ لو ایک رباعی اپنے مزاج کی بھی سُن لو:

مے نوشی تے کرداآں میں ناز اے ساقی
مغرب تہ عشاء نال نیاز اے ساقی
بعد حسیناں دی ملاقات دے میں
شکرانے دی پڑھدا آں نماز اے ساقی

ابھی وہ اپنی رباعیاں سُنا ہی رہے تھے کہ ایک جوڑا آدھمکا۔ ایک سائنس کے پروفیسر تھے۔ دوسری ان کی اہلیہ جو قطعاً پنجابی نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہوں نے ان کی

پنجابی شاعری کو ان کا خبط قرار دیا۔

اس پر صادقین نے کہا" طفیل صاحب! ان لوگوں کی دنیا الگ ہے۔ یہ اپنی دنیا میں مست ہیں۔ ہم اپنی دنیا میں مست ہیں۔ نہ یہ ہمیں قائل کر سکتے ہیں۔ نہ ہم انہیں قائل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم ایک دوسرے کو، ان کے اپنے حال پر کیوں نہ چھوڑ دیں؟"

اس پر خاتون نے کہا" کیا کسی مسئلہ میں، ایک سائنسدان، ایک ریاضی دان، یا ایک شاعر اور مصوّر متفق بھی ہو سکتے ہیں؟"

صادقین کا جواب یہ تھا" عورت کے مسئلے پر!"

میرا نعرہ یہ تھا" سبحان اللہ"

پروفیسر صاحب نے فرمایا" کیا عورت سے بڑھ کر، اس کائنات میں کوئی بھی دلکشی نہیں ہے؟"

صادقین ترنگ میں آ گئے" بالکل نہیں۔ ہم نیچر کے خلاف سوچیں گے تو خود کو فریب دیں گے۔ ہمارا مذہب کہتا ہے کہ حوّا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔ میرا اس پر ایمان ہے۔ میرے نزدیک نر اور مادہ اصل میں ایک ہیں۔ جیسے پلیٹ ٹوٹ گئی ہو مگر اُس میں جُڑنے کی صلاحیّت تو ہے۔"

معرفت کی ایسی باتوں میں، میرا مطالعہ صفر کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے موقعوں پر دماغ کی تمام ترکھڑکیاں کھول دیتا ہوں تاکہ نرا بُدھو ہی اس دنیا سے نہ اُٹھ جاؤں۔ صادقین کہہ رہے تھے" عورت کی کُل کائنات مرد ہے۔ لیکن مرد کی کائنات میں بہت کچھ ہے۔ جن میں ایک عورت ہے۔"

اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ جو جوڑا آیا تھا وہ جانے کے لیے تیار ہوگیا - اُن کی "رخصتی" کے بعد میں نے صادقین سے کہا "میں اس سے پہلے بھی آپ سے ملتا رہا ہوں مگر جانا آج ہے - آپ تو بہت دلچسپ آدمی نکلے - کائنات کے اسرار و رموز سے واقف، عورت کی نفسیات کے ماہر، اگر مجھے کبھی وقت مِلا تو مَیں آپ کی شخصیت پر بھی کچھ لکھوں گا - مگر اب مجھے اجازت دیجئے - کل پھر حاضر ہوں گا -

دوسرے دن وقتِ مقررّہ پر پہنچا - دروازہ تھپتھپا رہا ہوں - مگر کوئی آواز نہیں - دیکھا تو دروازہ کھُلا - کواڑ کھول کے کمرے میں داخل ہُوا تو دیکھا جناب سو رہے ہیں، پہلے میں کمرے میں ٹہلتا رہا پھر بوتل میں سے پانی لے کر پیا - غٹ غٹ، پھر ہوں ہوں کیا، مگر اُدھر خوابِ خرگوش والا معاملہ، پھر وہیں پڑی ہوئی ایک نوٹ بک دیکھی، کھولی تو لکھا تھا "فلاں، سٹالن، ہٹلر" گھبرا کر دوسرا صفحہ کھولا - لکھا تھا "وہ قد میں اُونچی تھی - اُس نے مجھے دیکھ لیا" اس کے بعد کوئی صفحہ نہ کھولا، مگر یہی نوٹ بک جب بعد میں صادقین صاحب نے کھولی تو میں نے دیکھا - اس میں اُن کا کلامِ بلاغت نظام لکھا ہوا ہے - کہیں کہیں تصویریں بنی ہوئی ہیں - یعنی یہ ان کی بیاض تھی - مگر اُس وقت مَیں ان کی بیاض کو کیا کرتا - وہ خود تو اُٹھ نہیں رہے تھے - چنانچہ مَیں نے سوچا - بیگ میں سے کاغذ اور قلم نکالوں اور کچھ لکھنے لگ جاؤں - کیا لکھوں؟ یہ اس وقت تک کچھ طے نہ ہوا تھا - مگر میں نے دیکھا کہ جیسے ہی کاغذ کی ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ ہوئی - صادقین جاگ اُٹھے - میں نے کہا "عجیب قصّہ ہے؟"

"کیا؟"

"میں دروازہ تھپتھپاتا رہا - غٹا غٹ پانی پیا - ہنکارے بھرتا رہا - مگر آپ نہ اُٹھے -

اب ذراسی کاغذ کی آواز پر چونک پڑے۔"

"کاغذ اور قلم سے تو میرا رشتہ ہے۔ باقی چیزوں سے رشتہ نہ تھا۔"

میں نے ان سے کہا "میں نے اُردو میں آپ پر لکھا ہوا کوئی مضمون نہیں پڑھا۔ کیا کچھ چھپا ہے۔ آپ کی شخصیت و فن پر؟"

کہنے لگے "انگریزی میں تو بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ پلندوں کے پلندے، مگر اُردو میں چند ایک ہی مضمون ملیں گے۔ یہاں گھر کی مرغی دال برابر والا حساب ہے۔"

"اچھا تو میرے دال برابر بھائی، اگر آپ پر کوئی لکھنا چاہے تو آپ کا رویّہ کیا ہوگا؟"

"میرا رویّہ کیا ہوگا۔ میں اس کا شکرگزار رہوں گا۔ مگر یہ ہے کہ جو مجھے سمجھ اور جان کر لکھے گا۔ وہ مجھے دوسروں تک پہنچا سکے گا۔ جس نے اپنی من مانی کارروائی کر دی۔ وہ مجھے رسوا کرے گا۔ خود بھی گالیاں کھائے گا اور مجھے بھی کھلوائے گا۔"

"لکھنے والا تو گالیوں سے نہیں ڈرتا۔ مگر اُسے یہ احساس ضرور ہونا چاہیئے کہ اس کے قلم کی جنبش، کسی بھی قسم کی غلط شہادت نہ دے۔"

"اگر یہ احساس ہو تو پھر دونوں بہ ہی عافیت گزر جائے گی۔ ورنہ دونوں مارے جائیں گے۔ ہر شخص کی زندگی میں نشیب و فراز ہوتے ہیں۔ اگر زندگی ہموار ہو تو کیا لطف، ہر ہر قدم پر قدرت کے بکھرے ہوئے اسراروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کل کیا ہوگا۔ یہی اصل زندگی ہے۔"

میں نے چھیڑا "آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو کہ کل کیا ہوگا۔ مجھے معلوم ہے۔ بیوی کے گلے شکوے، بچّوں کی فرمائشیں، دوستوں کے خلوص سے واسطہ، دفتر کے کام کو گھر پہ لانا

اور بیوی کا یہ کہنا۔ دن بھی کام، رات بھی کام، یہی کچھ کرنا تھا تو شادی کیوں کی تھی؟ اس پر میرے ہاتھ سے قلم چھین لینا۔ کتاب کو پرے پھینک دینا۔"

"پھر تو آپ کی زندگی بڑی رومانٹک ہے۔"

"جی ہاں بڑی رومانٹک!"

"بھئی قصہ یہ ہے کہ میں تو زندگی کے بارے میں یوں سوچتا ہوں کہ آغا خاں کی زندگی میں کچھ نہیں رکھا۔ نہ کوئی امنگ، نہ کوئی ولولہ، نہ کوئی فکر، نہ کوئی خوشی، بس ایک ہموار سی زندگی ہے۔ جب تک زندگی میں ایک تھرّل نہ ہو۔ زندگی کرنے کا کوئی لطف نہیں۔ اچانک اور غیر متوقع طور پر واقعات کا ظہور پذیر ہونا ہی عینِ زندگی ہے۔"

میں نے صادقین سے کہا۔ "کل آپ نے عشق و عاشقی کی بات کی تھی۔ چوں کہ میں جلدی میں تھا۔ اس لیے میں نے سوچا۔ فرصت کے معاملات کو فرصت ہی کے لمحات میں سوچنا چاہیئے۔ آخر عورت آپ کے اعصاب پر کیوں سوار ہے؟ تصویروں میں بھی وہی، خیالات میں بھی وہی!"

بے شک عورت، میری تصویروں کی جان اور میری شاعری کی رُوح ہے۔ میرے خیالات میں بھی اُسی کا راج ہے۔ مگر وہ میرے جذبات پر حاوی نہیں۔ میں عاشق نہیں حُسن پرست ہوں۔ میں نے کسی خاتون کو اپنے جی کا جنجال نہیں بنایا۔ بس اتنا ہے۔ جہاں منظر اچھّا ہو، وہیں ذرا اُونگھ جاتا ہوں۔ ہر اچھّی صورت میرے لیے ذہن نشین ہوتی ہے۔ دل نشین نہیں ہوتی۔"

"آپ کا عشق تو پھر بڑا ہر جائی قسم کا ہوا۔"

"جو بھی الزام دیں۔ مجھے منظور! مگر میرا معاملہ یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر خوبصورت چیز میری محبوبہ ہے۔ وہ میری ہے۔ میں اس کا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں حسینوں کے جھرمٹوں میں بھی حواس نہیں کھوتا۔ اُن کی موجودگی میں تصویریں بھی بنتی ہیں۔ شعروشاعری بھی ہوتی ہے۔"

"ایسے میں آپ کے اعصاب میں جھنجھناہٹیں نہیں ہوتیں؟"

"میں نے ہمیشہ یہی جانا۔ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔ دوسرے یہ بھی نہیں کہ پتھر ہوں۔ مجھ میں محسوس کرنے کی حسیات عام لوگوں سے زیادہ ہیں۔ پھر آپ حُسن کو محدود کیوں کرتے ہیں۔ حُسن ہر چیز میں ہوتا ہے۔ ہر بھونڈی شے میں بھی کچھ ڈھونڈیے۔ ہر خوبصورتی کو دل کے آرپار اُتاریئے۔ اس کے بعد عورت کے تصوّر کو اپنا ملجا و ماوی بنایئے۔ اس کے بعد دیکھئے۔ زندگی زیادہ لطیف معلوم ہوگی۔"

"اصل بات یہ ہے کہ آپ کی سوچیں اتنی لطیف ہوگئی ہیں کہ بندہ ان سے ذرا دُور ہی رہے تو اچھا ہے۔ اپنا تو خیال ہے کہ مرد کی زندگی میں اگر کہیں اٹکنا نہیں لکھا تو زندگی بے معنی ہے کیونکہ آپ نے تو ایک خوبصورت عورت کو، ایک خوبصورت میز اور ایک خوبصورت پیالی کے مترادف سمجھ رکھا ہے۔"

"یوں تصوّر نہ کیجئے۔ یوں تصوّر کیجئے کہ عورت کے معاملے میں، آپ کی سوچیں محدود ہیں۔ میری غیر محدود! کیونکہ میں ایک دائرے کے اندر اپنی سوچوں کو کسی بھی طرح قید نہیں کرسکتا۔ باقی رہا شاعری کا معاملہ تو میں مابعدالطبیعاتی مسائل کی بجائے مانگ اور چوٹی کی شاعری کو ترجیح دوں گا۔ کیونکہ اس میں بڑی بڑی باریک باتیں کہی جاسکتی ہیں۔

بڑی بڑی تہہ دار باتیں کہی جا سکتی ہیں اور ہر نوع سے کہی جا سکتی ہیں۔ اس پیرایہ کو اختیار کرنے میں، مَیں فائدہ یہ دیکھتا ہوں کہ اس طرح جو کچھ کہا جائے گا۔ وہ سب کی سمجھ میں آسکے گا۔ میں علم و دانش کے پہاڑوں کو سر کرنا نہیں چاہتا۔"

اس موقع پر میں نے ان کے نظریات میں تضاد کی بات نہ کی۔ ورنہ عین ممکن تھا وہ اپنی بات کہہ نہ سکتے۔ اب تو صرف اتنا ہی ہے نا کہ مَیں بعض باتوں کو، ان کی سوچوں کے مطابق سمجھ نہ سکا۔ بہر حال وہ کہہ رہے تھے کہ میں ہیجان انگیزی اور اشتعال انگیزی کو شاعری نہیں سمجھتا۔ پھر شہوانی اور جمالیاتی شاعری میں بھی فرق ہے۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ حُسن پرستی میں سنسنی اور گُدگُدی کا جو پہلو ہے۔ بس وہ مار رکھتا ہے۔

"بجا ارشاد!"

ایک شاعر نے مجھ سے کہا۔" میں نے ایک لاکھ شعر کہے ہیں"۔ میں نے کہا۔" آپ نے دو لاکھ مصرعے کہے ہوں گے۔ لیکن شاعری دُور کی بات ہے۔ شعر لطیف و نازک چیز ہے۔ اگر کوئی بات بحر میں منظوم کر دی جائے تو وہ شعر نہیں بنتی۔"

"آپ کا شاعری کے بارے میں بڑا کڑا معیار ہے۔ مگر آپ کا اپنی شاعری کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں نے تصویریں بنائیں جو میرے نظریۂ حیات کی حامل ہیں۔ جو میرے خیالات کی ترجمان ہیں۔ جو میرے فکر کی اڑان ہیں، جب مجھ سے میری تصویروں کے بارے میں استفسارات ہونے لگے تو میں نے اپنے آپ کو فنی طور پر دوسروں پہ ظاہر کرنے کے لیے شعر کہے ورنہ میں شاید ادھر توجہ نہ دیتا۔ میری شاعری، میری مصوّری کی تفسیر ہے۔ اس سے زیادہ میں اپنی شاعری

کو اہمیت نہیں دیتا۔"

"یعنی آپ کی شاعری آپ کی مصوری کے لیے، پرچہ ترکیب استعمال کا کام دیتی ہے۔"

"جی ہاں! یہ ایک ایسا پرچہ ترکیب استعمال ہے جس میں میرا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے، جس میں فکر کروٹیں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ میں نے جس حد تک اپنی موزونیٔ طبع سے کام لینا چاہا تھا۔ وہ لیا۔

اتنے میں وہ پھر مصوری کی طرف نکل آئے۔ کلیسائی دور میں مصوّر محض پوپ کی تصویریں بنایا کرتے تھے۔ بادشاہوں کے دور میں شہزادوں کی تصویریں ہی حسن کا معراج تھیں۔ پھر مناظرِ قدرت میں حُسن دکھائی دینے لگا، اس کے بعد انقلابِ روس نے انسانوں اور محنت کشوں کے حُسن کی طرف توجہ دلائی۔ (اس کے بعد صادقین تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئے۔ آنکھیں بند کیں۔ پھر دوسرے رُخ سے بات کی) آج ہم فیشن کے طور پر عالمِ بالا کی بات کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ عالمِ بالا ہے کیا؟ غائر مطالعہ نہیں مگر اپنے عالم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ سچائی کہاں ہے؟ اس پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں۔ میری تصویروں میں جو کرب کے نقشے ہیں۔ اس پر اعتراض ہے۔ مگر ہماری زندگی میں جو کرب ہے۔ اس سے چشم پوشی ہمارا وطیرہ ہے۔ مَیں جھوٹے مومن کے مقابلے میں سچے کافر کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

"ہمیں زندگی کے روشن پہلوؤں کی طرف بھی غور کرنا چاہیئے۔"

"کیجئے!"

"کیوں نہ کریں؟"

"ابھی میں آپ سے زندگی کے تاریک اور روشن پہلوؤں کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ بلکہ میں آپ سے یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ہمیں منافقت کی چار دیواری کو ڈھا دینا چاہیئے۔ ایک شخص جو جبہّ وعمامہ کے ساتھ ساتھ اپنے سر پر علم کی لائبریری کو سجائے ہوئے ہو۔ اس کی صورت سے بھی زُہد و تقدس برس رہا ہو۔ سایۂ ریش کے ڈھونگ کے باوجود اس کے دل میں ایک عورت بسی ہو تو اس کے مقابلے میں مَیں اُس ننگے فقیر کو ترجیح دوں گا۔ جو نہ صرف اپنے جسم کے اعتبار سے ننگا ہے۔ بلکہ اپنے خیالات و محسوسات کے اعتبار سے بھی ننگا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک ایسے ہی بزرگ کے بارے میں کہا تھا :

مسند پہ کتابِ دیں رکھی تھی، اِک پیر
اخلاق پہ کر رہا تھا کب سے تقریر
پھر میں نے بھی مسند کو وہیں سے کاٹا
مسند کے تھی نیچے جہاں ننگی تصویر

صادقین کی رباعی کے جواب میں مَیں نے بھی اسی مضمون کا، اکبر الہ آبادی کا یہ شعر پڑھا ؂

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اُجالے میں چوکتا بھی نہیں

صادقین بہت کچھ کہنے کے موڈ میں تھے "ہم حقیقتوں سے آنکھیں چراتے ہیں۔ ویتنام کی جنگ ہمیں متاثر نہیں کرتی۔ اُس بربریت اور وحشت پر احتجاج نہیں ہوتا ——— ایک بربریّت کی قوّت ہے۔ ایک حق و انصاف کی، ان کے درمیان معرکۂ حق و باطل ہوتا ہے۔

بربریت عارضی طور پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے مگر وہاں انسانیت کے چراغ کو تو نہیں بجھایا جاسکتا۔ بربریت کے زور پر انسانی قدروں کو تو ختم نہیں کیا جاسکتا۔"

"جی"

"مَیں ڈاؤن ٹو ارتھ یعنی زیرِ زمین مدافعت کا قائل ہوں۔ دشمن کو برباد کرنے کے لیے ٹرین کا اُلٹانا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ فوجی ٹھکانوں اور تیل کے ذخائر کو تباہ کرنا بھی جائز سمجھتا ہوں۔"

"آپ کا رول تو ایک گسٹاپو کا سا ہے۔"

"بات یہ ہے کہ یہ زاویہ کا فرق ہے۔ ایک فوج کشی اس لیے کر رہا ہے کہ ملک پر قبضہ کرے۔ ایک جد و جہد اس لیے کر رہا ہے کہ انسانیت کا بول بالا ہو، اخلاقی قدروں کا احیا ہو۔ میرا تعلق فوج کشی کرنے والے گروہ سے نہیں بلکہ اُس سے ہے جو انسانیت کے لیے لڑے گا۔ جو اخلاقی قدروں کے لیے لڑے گا۔ اپنا ہیرو وہی ہے۔"

"آپ کا ہیرو تو بڑا دہشت پسند ہے۔"

"ہمارا ہیرو دہشت پسند نہیں، انسانیت پسند ہے۔ مَیں اپنی بات کو ایک اور طرح سے واضح کرتا ہوں۔ مثال کے طور پر ایک سمگلر ہے۔ اس کا گھر زینت کا گہوارہ ہے۔ بہترین قالین بچھے ہیں۔ چھتوں پر جھاڑ اور فانوس لٹک رہے ہیں۔ شراب کے دَور چل رہے ہیں۔ نیم عُریاں تصویریں آویزاں ہیں۔ اس ماحول میں سمگلر کے پہلو میں اس کی داشتہ ہے جو اپنی مسکراہٹوں اور تبسّموں سے اس کا دل لُبھا رہی ہے۔ اس کے برعکس، جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جا رہا ہو۔ ڈسٹ بن پڑا ہو۔ ایک شخص پس خوردگی کی تلاش میں ہو۔ کھوجتے کھوجتے

اُسے ایک روٹی کا ٹکڑا مل گیا ہو۔ اُس وقت اُس شخص کے چہرے پر جو حقیقی مسکراہٹ آئے گی۔ ہم اس کے مصوّر ہیں۔ ہم داشتہ کے مصوّر نہیں۔ کیونکہ اس کی مسکراہٹ بھی مصنوعی ہے۔ میرے نزدیک خوبصورت منظروں میں صداقت نہیں۔ ہم شہ نشینوں کے آرٹسٹ نہیں۔ ڈسٹ بنوں کے مصوّر ہیں۔ سوسائٹی کا ہیرو اسمگلر ہے اور ہمارا ہیرو معاشرے کی فلاح کے لیے تختۂ دار پر چڑھتا ہے۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لیے رُکے! میں نے سوچا۔ اب یہ کہیں اور نکل جائیں گے کیوں کہ یہ اِدھر اُدھر کھوئے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں نے ایک دن اُن سے پانی مانگا۔ اُٹھے، گلاس دھویا مگر پانی نہ دیا۔ بھول گئے۔ کھانا منگوایا تھوڑی دیر پہلے بھوک کا اظہار کیا۔ مگر جب کھانا آیا تو پڑے پڑے ٹھنڈا ہو گیا۔ کھایا نہیں۔ دوست سے اصرار کیا۔ چائے پیجئے۔ خود جا کر کسی سے کہا۔ چائے لائیے۔ جب دیر ہو گئی تو دوبارہ جا کر بھی کہا مگر جب چائے آگئی تو پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی۔ اب مہمان کیسے کہے۔ جناب! مجھے چائے پلا دیجئے مگر اس کے برعکس جب یہ اپنے فن پر بات کرتے ہیں تو پھر ان کے سلسلے کا تار کم ہی ٹوٹتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ٹوٹے دھاگے کو پھر سے گانٹھ لگائی — فن کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ ایک نظریہ ہے تفنّنِ طبع کا، اس کا بڑا کمال یہ ہے کہ جذبات میں ہیجان انگیزی اور سنسنی پیدا کی جائے۔ پُرسکون ماحول میں اشتعال پیدا کیا جائے۔ میرا انداز جُدا ہے۔ وہ یہ کہ انسانیت آگے بڑھ رہی ہے۔ اس بڑھتی ہوئی طاقت کے راستے میں رجعت پسند طاقتیں جو روڑے اٹکاتی ہیں، مزاحم ہوتی ہیں اُن رکاوٹوں کو ہٹانا، اُن خندقوں کو پُر کرنا، یعنی رجعت پسند قوتوں سے نبرد آزمائی ہمارا فن ہے اور اُن قوتوں سے جو حائل ہوں اعلانِ جنگ

ہمارا نظریہ ہے ۔ اصولِ اعلیٰ پر کاربند رہنا۔ یہ درجۂ پیغمبری ہے ۔ اس راہ میں جتنی لالچیں اور منفعتیں ہوتی ہیں وہ سب ہیچ ہیں ۔ انہیں نظر انداز کر کے زندہ رہنا، کارِ محال ہے ۔

کارِ محال !

صادقین بڑے اچھے موڈ میں تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ لہرا لہرا کے باتیں کیے جا رہے تھے ۔ اپنے اُلجھے ہوئے بالوں سے بے پروا، کبھی آنکھیں بند کر کے دو چار جملے کہہ دیتے ۔ کبھی اپنی جھُوم جھُوم کے باتیں کرنے والی ادا سے رجھاتے، کبھی اپنی باریک سی مسکراہٹ سے شاد کام کرتے، کبھی اپنے ٹُتے ہوئے لہجے سے کانوں میں رس گھولتے ۔ یہی سماں تھا کہ انھوں نے کہا :۔

"میں بوعلی سینا کے بارے میں لیکچر سُننے کو تضیع اوقات سمجھتا ہوں کیوں کہ وہ میری سمجھ سے بالا ہے ۔ اس لیے میں اس محفل میں کیوں بیٹھوں ؟ مگر کچھ لوگ وہاں اس لیے جائیں گے کہ اس طرح رائج الوقت اصولوں کے مطابق، اُن کے صاحب علم ہونے پر یقین ہو سکے گا ۔ مگر ہمارا ہیرو دوسرے ٹائپ کا ہے ۔ وہ جماعت کا نقصان کر کے اپنا ذاتی فائدہ نہ اُٹھائے گا، اپنی جان پر سب کچھ جھیل جائے گا ۔ کیونکہ اس کا رشتہ ڈاؤن ٹُو ارتھ سے ہے ۔ وہ آسمانوں کی باتیں نہیں کرتا ۔ وہ زمین پر رہتا ہے ۔ زمین والوں کے دُکھ کا ساتھی ہے ۔"

"بے شک آپ کا ہیرو زمین والوں کے دُکھ کا ساتھی ہے ۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ کیوں بُوعلی سینا کی محفل میں نہ بیٹھے ۔ وہ کیوں علم حاصل نہ کرے ؟"

"بات یہ ہے کہ میں خواص کا نہیں عوام کا مصوّر ہوں ۔ فرد کا نہیں ، جماعت کا مصوّر ہوں ۔ مَیں جانتا ہوں کہ میرا ہیرو ابھی شمس تبریز کے مسائلِ تصوّف سے روشنی حاصل نہیں

کر سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا ہیرو بوعلی سینا کے فلسفۂ کائنات اور اس کی ماہیت اور اس کی ساخت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس لیے کسی مدرسے میں علم کی روشنی حاصل کرنے کی بجائے، کیوں نہ وہ چاندنی رات میں کسی شاخِ گُل کے سایہ کے نیچے بیٹھ کر کسی انارکلی سے ملاقات کرے!"

"صاحب آپ کا ہیرو ہزار انارکلیوں سے ملاقات کرے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں مگر مجھے اس سے کسی طور اتفاق نہیں کہ وہ بوعلی سینا اور شمس تبریز کی محفلوں میں نہ بیٹھے۔"

"آپ غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں بے شک پیٹ سے بھُوکا رہوں مگر برٹنڈرسل کا لیکچر ضرور سُنوں۔ مجھے تبؔلی کے علم الکلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے برعکس سینما دیکھنا، کسی معشوق سے ملنا، دل خوش کرنا۔ کسی معمولی لڑکی کا ناچ دیکھنا۔ معرفت کے لیکچروں سے زیادہ حقیقی ہوگا۔ بہرحال میں تو علم وادب کی گھاٹ سے پیاس بجھانے کی بجائے یہ زیادہ بہتر سمجھوں گا کہ کسی لڑکی سے دل بہلایا جائے۔"

صادقین صاحب باتیں خُوب مزے مزے کی کرتے ہیں، سرشاری والی بھی، لذّت آمیز بھی۔ لیکن بات کو رڑک[1] کر کرتے ہیں۔ اندازِ گفتگو مدُھر مگر دھیما، مگر کسی کسی وقت لُکنت کے سے آثار ہویدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ وقت وہ ہوتا ہے جب شعلۂ وارد سے آسودہ ہوتے ہیں۔ ایک دن کہنے لگے "جو شراب پیتا ہے۔ وہ بُرا آدمی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"جی وہ تو فرشتہ ہوتا ہے۔"

---

[1] یہ لفظ پنجابی کا ہے۔

"فرشتہ نہ کہو، ولی اللہ کہو"

"یہ تو مداخلت فی الدّین والی بات ہے"

"مداخلت فی الانسان کے بعد، مداخلت فی الدّین کی نوبت آتی ہے۔ ہمارے ہاں مداخلت فی الدّین کا خیال سبھی کو ہے لیکن مداخلت فی الانسان کا کہیں وجود نہیں۔ یعنی یہ تو وہی بات ہوئی کہ ہم پہلی سیڑھی پر قدم رکھے بغیر آخری سیڑھی پر قدم رکھ دیتے ہیں کہ جو ناممکن سی بات ہے۔ لیکن ہمارا مزاج ایسا ہے کہ ہم ہر ناممکن بات کو ممکن سمجھ لیتے ہیں۔ یہ قوم اتنی خوش فہمیوں کا شکار ہے کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ساری دنیا میں بے قیمت ہوگیا"

ان کا خیال ہے کہ ہمیں اپنے آنگن کی ٹیڑھ کا تو خیال نہیں لیکن دنیا جہان کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن کے ذریعہ ہر لبادۂ منافقت کو تار تار کیا۔ بہر حال یہ اپنی مسکراہٹوں اور اندیشوں کے ساتھ، مولیٰ کے کرم اور حسینوں کی مدد سے اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔ پھر ان کے موقلم سے جو کچھ ظہور میں آتا ہے۔ اُسے تحفۂ درویش کے طور پر اِدھر اُدھر بانٹتے رہتے ہیں۔ یہی فن کی زکوٰۃ، ان کے فن کو آسمان تک اُڑا لے گئی۔

یہ جھوٹے اخلاق کے قطعاً روادار نہیں۔ یہ کسی کا دل رکھنے کے لیے بھی، بناوٹ کے رشتوں کو استوار نہیں کر سکتے۔ انہیں ریاکاری سے بیر ہے۔ اگر کبھی ضرورت پڑی تو یہ بلا تامّل سرمد و منصور کے خاندان کے ساتھ جا شامل ہوں گے۔ ان کا خیال ہے کہ اخلاقیات کی بنیاد منافقتوں پر رکھی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ منافقتوں کے خول کو توڑا جائے۔ مثال کے طور پر ایک مولانا حاجتِ غسل سے ہیں۔ ٹھنڈی یخ ہوا چل رہی ہے۔ پانی برف بن گیا

ہے۔ وہ ایسے میں غسل نہیں کرتے۔ مگر انہوں نے لبادہ تقدّس کا اوڑھ رکھا ہے۔ دین کے ٹھیکیدار بنے ہوتے ہیں۔ وہ اسی حالت میں مسجد کی طرف چل دیتے ہیں۔ سیڑھیوں کے قریب انہیں ایک سچّا آدمی، یعنی میرا ہیرو ملتا ہے۔ مولانا اُسے نماز کے لیے ارشاد فرماتے ہیں۔ مگر وہ کہتا ہے کہ میں غسُل کی حاجت میں ہوں۔ اس لیے مسجد نہیں جا سکتا۔ مولانا تو اُس وقت زور سے یہ فرما دیں گے لاحول ولاقوۃ! مگر مولانا ہیں کہ اپنے من کے شیطان سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔"

دل نے کہا۔ موضوع بدلنا چاہیئے۔ پھر کچھ سوچ کر رُک گیا۔ کیونکہ اُردو والوں سے، اُردو کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ وہ ایکدم ہمیں بے وقوف سمجھ کر، اپنی فضیلتوں اور امارتوں کے راگ الاپنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں کے وہ وہ نقشے کھینچیں گے کہ رقّت طاری کر دیں گے۔ یوں ہمیں اپنی "ہیچمدانی" پر ندامت سی ہوگی اور پھر وہ فاتحانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھیں گے۔ جیسے انہوں نے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو۔ ڈرتے ڈرتے میں نے ان سے استفسار کیا کہ "پچھلے دنوں جب کراچی میں لسانی جھگڑے ہوئے تھے۔ اُن دنوں آپ کراچی میں تھے یا اسلام آباد میں؟"

"صاحب! اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مَیں کہاں تھا مگر وہ قضیہ تھا غلط، اُردو ایک زندہ اور توانا زبان ہے۔ اس میں حدّت ہے۔ گرمی ہے۔ کرنٹ ہے۔ اسے کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ اس کے بارے میں واویلا سب بیکار تھا۔ ارے بھئی کوئی بہتے دریا کو روک سکتا ہے؟ اگر کوئی بند باندھے گا تو پانی کسی دوسری سمت بہنے لگ جائے گا مگر دریا کے وجود کو تو ختم نہیں کیا جا سکے گا؟"

میں نے محض چھیڑ کے لیے چھیڑا۔" اہلِ زبان بڑے نازک مزاج ہوتے ہیں۔ صاحب! ان کے "روزمرّہ" کو خطرہ لاحق ہے۔ ان کا محاورہ ختم ہوا جا رہا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ زبان کو کوئی خطرہ نہ تھا۔"

"طفیل صاحب! آپ کی مسکراہٹ بتا رہی ہے کہ آپ نے مجھ سے کچھ اگلوانے کے لیے یہ بات کہی ہے۔ اس لیے میں آپ سے اپنے دل کی بات ضرور کہہ دوں گا۔ چاہے میرے اُردو بولنے والے بھائی مجھ سے ناراض ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ قصّہ یہ ہے جناب! جب آپ اودھ سے چلے آئے تو پھر آپ اُس اُردو کی کیوں بات کرتے ہیں جو وہاں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ زبان ایک خاص مٹی اور پانی سے بنتی ہے۔ زبان کا تعلق جغرافیہ سے بھی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اودھ کے اگالدان، پاندان اور پیچوان کو، یہاں سندھ کے ریگستانوں میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"صادقین صاحب! زبان کے معاملے میں، آپ تو مجھ سے بھی خطرناک آدمی ثابت ہوئے میں نے چند برس پہلے اُردو والوں سے صرف اتنا کہا تھا کہ پاکستان میں اُردو صرف اسی صورت میں ترقی کر سکے گی کہ اُردو میں سندھی، بلوچی، پنجابی اور پشتو کے کھپ جانے والے الفاظ کو بھی سمو دیا جائے تاکہ یہاں کے رہنے والے اُردو کو اپنی ہی زبان سمجھیں اور اس کے ساتھ ذرا یہ بھی جسارت کی تھی کہ مقامی لہجوں کے اعتبار سے جو اُردو کو ذرا سی ٹھیس پہنچے گی اُسے بھی برداشت کر لیجئے۔ میری اس تجویز پر ہر طرف سے مخالفت ہوئی تھی اور میں نے اُسی وقت سمجھ لیا تھا کہ اب اس زبان کا اللہ حافظ ہے کیونکہ ہمیں یہ سمجھایا جا رہا تھا کہ پنجابی، سندھی، بلوچی اور پختون کون ہوتے ہیں جو ہماری گنگ و جمن

کی وادیوں میں پروان چڑھنے والی زبان کو گزند پہنچائیں ؟"

میں نے ابھی کچھ کہنے کے لیے زبان کھولی ہی تھی کہ انہوں نے کہا۔" طفیل صاحب! قطع کلام! ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے اپنی زبان کے بارے میں کہا تھا کہ ہماری زبان، دوسری زبان کے الفاظ کو بھی اپنے پہلو میں جگہ دیتی ہے۔ اس لیے یہ زندہ زبان ہے اور کبھی نہیں مر سکتی۔ اُسی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ اُردو زبان میں انگریزی زبان سے زیادہ لچک ہے۔ پھر وہ کیوں نہ دوسری زبانوں سے الفاظ لے۔ جبکہ حقِ نمک کا بھی یہی تقاضا ہو حقِ نمک اِن معنوں میں، یہاں کسی صوبے کی زبان اُردو نہیں۔ پھر ہم کیوں پناہ دینے والوں کو یہ سمجھائیں کہ آپ میں اور ہم میں بُعد ہے۔ اُردو والے جب یہ کہتے ہیں کہ پاکستان ہم نے بنوایا تو میں اُن سے یہ کہتا ہوں تو پھر کیوں بیگانگی کی تلوار سے اسے ختم بھی کر دینا چاہتے ہو ؟"

" صادقین صاحب! میرا خیال ہے کہ ہم اس موضوع کو یہیں پہ ختم کر دیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کا لہجہ، اندازِ فکر کہیں ہمیں شہادت کے درجے تک نہ پہنچا دے۔"

" طفیل صاحب! زبان سے محبّت ہونا اور بات ہے۔ زبان سے طفلانہ محبّت ہونا دوسری بات ہے۔ اب یہاں والوں کو زبان سے طفلانہ محبّت ہے۔ اس کے وسیع تر مفاد پر کسی کی نظر نہیں۔ اُردو تو خانہ بدوش زبان ہے۔ پہلے یہ قطب شاہیوں کی زبان تھی۔ پھر مُغل بچے، اس کے بانکپن کو بھانپ کر دلّی سے لے آئے۔ مُغلوں کے پاؤں اُکھڑے تو یہ نوابینِ اودھ کے حرموں میں چلی گئی۔ وہ اسے نوچتے کھسوٹتے رہے۔ مگر زبان سے جنھوں نے صحیح معنوں میں محبّت کی وہ پنجاب ہے۔ اس خطّے کی مادری زبان اُردو نہ

تھی مگر اس خطے نے اُردو کی اتنی خدمت کی ہے کہ اُردو کو جنم دینے کے دعویداروں کو بھی نصیب نہ ہوئی ۔ کہئے تو یہ بات حروفِ خفی میں نہیں، حروفِ جلی میں لکھ کے دے دوں؟"

"نہیں لکھ کر دینے کی ضرورت نہیں ۔ کیونکہ اہلِ پنجاب میں سے بہتوں نے اس زبان کی ترویج و ترقی میں اپنی زندگی گزار دی مگر اہلِ زبان کا نخرا اپنی جگہ پر رہا۔ انہوں نے تھپکی تک نہ دی ۔ ہمیشہ یہی سمجھایا اور لکھا کہ "ہم تو ہم ہی ہیں" لکھنے میں بھی ڈنڈی ماریں گے ۔ انھوں نے اپنوں کو آسمان پہ بٹھایا ۔ بیگانوں کو تحت الثریٰ میں گرایا ۔ مگر وقت جو عادل شاہد ہوتا ہے ۔ وہ ضرور اپنا فیصلہ سنائے گا ۔ مگر ہم وقت کی راہ میں جو تنگ نظری کے کانٹے بچھا رہے ہیں ۔ وہ ضرور بھٹکائیں گے مگر منزلوں کا سراغ پانے والے اپنی آبلہ پائیوں سے نہیں ڈرتے ۔"

"طفیل صاحب! میری بھی تو سُنیئے ۔ جن انجمنوں نے قوم سے لاکھوں روپے لے کر اُردو کی خدمت کی ۔ میں اُسے خدمت قطعاً نہیں سمجھتا ۔ میرے نزدیک تو خدمت یہ ہے کہ اپنی جیب سے کی جائے اور اس سے پیار کا رشتہ نہ توڑا جائے ۔ کچھ لوگوں نے صرف اُردو کا شور مچایا ہے ۔ خدمت نہیں کی ۔ مگر آپ لوگ تو قُم باذنی کہنے والوں میں سے ہیں ۔

اس کے بعد انہوں نے میری خدمات کو سراہا ۔ بہت سراہا ۔ اس کا ذکر میں اپنے قلم سے نہیں کر سکتا ۔ حالانکہ ان کا بہ شدت اصرار تھا ۔ اس واقعہ کے چند دنوں کے بعد، انہوں نے مجھے اپنی کتاب "رباعیاتِ صادقین نقاش" مرحمت فرماتے ہوئے جو کچھ لکھا تھا ۔ یہاں صرف وہی لکھے دیتا ہوں تاکہ میرے دوست بھی زیادہ جز بز نہ ہوں[1] اور ان کی حکم عدولی

---

[1] کیونکہ ہم بہت اعلیٰ ظرف واقع ہوئے ہیں ۔ ہم نہ تو کسی کی تعریف سُن سکتے ہیں اور نہ کسی کو اچھی حالت میں دیکھ سکتے ہیں ۔

سے بھی بچ نکلوں۔ کتاب پر لکھا "جناب طفیل کی تاریخی اور ادبی خدمات اور ان کی استواری استقامت اور استقلال کی قدر دانی کرتے ہوئے یہ نسخہ موصوف کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔"

میں نے صادقین کی خدمت میں گزارش کی کہ "اہلِ پنجاب نے کبھی بھی یہ نہیں سمجھا کہ اُردو ہماری زبان نہیں ہے۔ مگر اہلِ اُردو نے ہمیشہ ہی ہمیں یہ سمجھایا کہ اُردو تمہاری زبان نہیں، اس کے باوجود ہم کام کرتے رہے۔ یہی رویّہ انہوں نے یہاں سندھ میں روا رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی زبان کا عَلم اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ ضرورت ہے کہ جو جس صوبے میں رہتا ہے وہ وہاں کے اصل مکینوں کو بھی سینے سے لگائے۔ ورنہ اُردو پنجاب سے بھی منہ چھپائے کہیں چلی جائے گی۔ بلوچستان اور سرحد میں ابھی اس کی کمسنی کا دَور ہے۔ سندھ اور پنجاب کی بے دلی، اسے سرحد اور بلوچستان میں بھی لے ڈوبے گی۔"

"ہاں صاحب! میں سندھ میں گھوما ہوں۔ مضافات میں بھی گیا ہوں۔ وہاں کے پروفیسروں سے بھی ملا ہوں۔ وہاں کے وڈیروں سے بھی یاد اللہ ہے۔ وہاں کے صوفیوں سے بھی ارادت ہے۔ ان سب سے ملا ہوں۔ وہ سب مہمان نواز ہیں۔ وہ محبّت کرنے والے ہیں۔ وہ ہمیں اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ مگر ہم خود اُن سے دُور ہو رہے ہیں۔ ہم اپنی غلط روش سے ان کے دلوں میں جگہ نہیں بنا سکتے۔ اُردو کے سلسلے میں سندھیوں سے ہمارا مطالبہ ایسا ہی ہے۔ جیسے میں فرانس میں جا کر فرانسیسیوں سے کہوں۔ اُردو بولو۔"

مَیں کہیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ یہ اس حد تک سادہ رہتے ہیں کہ ان کی اس ہیئت کذائی پر اچنبھا ہوتا ہے۔ کپڑے میلے ہیں تو میلے سہی، گرمیوں میں بھی اگر شیروانی

گرم ہے تو گرم سہی، جوتا ٹوٹا ہوا ہے تو ٹوٹا ہوا سہی، غرض انہیں اپنے مرتبے کے اعتبار سے ٹیپ ٹاپ سے رہنا اگر آتا ہے تو رہنا نہیں چاہتے کیوں کہ ان کا خیال ہے۔ اچھے کپڑے پہننے سے، نہ کوئی اچھا انسان بن سکتا ہے اور نہ کوئی اچھا فن کار، پھر ان کا سوچنا یوں بھی ہے کہ میاں! اس ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی کو تو روٹی تک میسّر نہیں۔ پھر ہم کس برتے پر خوش پوشاکی کے سے تعیش کے متحمل ہو سکتے ہیں۔

ایک بار جب میں ان کے ہاں گیا تو یہ مجھے الوداع کہنے کے لیے ننگے پاؤں ہی نکل پڑے۔ صورت یہ تھی کہ شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ مگر پاؤں سے ننگے تھے۔ میں نے کہا، "بھیّا! یہیں رُک جائیے۔ کیونکہ آپ کے پاؤں میں جوتا نہیں۔ کہنے لگے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ صادقین جوتا پہنے تو صادقین، نہ پہنے تو صادقین! یوں وہ تقریباً ایک فرلانگ تک، میرے ساتھ چلے ہوں گے۔ پھر اسی شان سے واپس بھی گئے ہوں گے۔

چلتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ میں تو پلنگ پہ بھی نہیں سوتا۔ چٹائی بچھا کے زمین پر سوتا ہوں۔ کبھی چٹائی کا بھی تکلّف نہیں کرتا۔ مجھے زمین پر سونا اچھا لگتا ہے۔

"گرمیوں میں تو گزارہ ہو جاتا ہوگا۔ لیکن سردیوں میں؟"

"جو شخص تپتی زمین پر سو سکتا ہو۔ وہ ٹھنڈی یخ زمین پر بھی سو سکتا ہے۔"

"یہ تو اپنے آپ کو سزا دینے والی بات ہوئی۔"

"یہ بھی صحیح ہے۔ مگر اصل مسئلہ نفسِ مطمئنہ کا ہے۔ اللہ نے مجھے نفسِ مطمئنہ سے نواز دیا ہے۔ جملہ لوازم ٹیپ ٹاپ کے مہیا ہیں مگر طبیعت اِدھر نہیں آتی۔ لوگ جو

آپ کو لمبی لمبی گاڑیوں میں دندناتے نظر آتے ہیں۔ وہ کوئی مطمئن ہیں؟ ہرگز نہیں۔ منجانب غیب انہیں کسی نہ کسی چیز سے محروم رکھا گیا ہے۔ جبھی وہ اپنی اُس کمی کو پُورا کرنے کے لیے یا اُس غم کو بھُولنے کے لیے لمبی لمبی موٹریں خریدتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کا سُوٹ پہنتے ہیں۔ بو اور ٹائی لگاتے ہیں۔ حالانکہ گزارہ چھوٹی کار سے بھی ہو سکتا ہے۔ طفیل صاحب! یقین جانیے یہ لوگ جو بقول پنجابیاں "پھنّے خاں" ہیں۔ اصل میں "محروم خاں" ہیں اُن کا جینا کوئی جینا نہیں۔ ہمارا جینا اصل جینا ہے۔"

"درویشانہ نقطۂ نظر سے تو آپ کا کلیہ صحیح ہو سکتا ہے مگر جسے دنیاوی لُغت میں جینا کہتے ہیں۔ وہ تو ہمیں میّسر نہیں۔ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے بھی ترسنا پڑتا ہے۔ اُن کے لیے ہر نعمت ارزاں، ہمارے لیے ہر ضرورت عنقا۔"

"انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی خواہشات کو محدود سے محدود تر کرے۔ اس کے بعد جینے کا لُطف اُٹھائے۔ اس کی ایک مثال، میں یہ دوں گا کہ میں ایک دن کراچی کے اسٹیٹ بینک سے نکلا ٹیکسی کی تلاش تھی۔ وہ جب ایک دو منٹ تک نہ ملی تو میں نے سوچا حرکت میں برکت ہے۔ پیدل چل دیا۔ وہ وقت ڈیڑھ بجے کا تھا۔ خُوب دُھوپ تھی۔ اتنے میں دیکھا کہ سیّد کاظم رضا کی اتنی لمبی سی گاڑی، میرے قریب آکر رُکی۔ انہوں نے کہا "آیئے صادقین صاحب! میں آپ کو پہنچا دوں۔" میں نے کہا۔ میں کسی مجبوری سے نہیں۔ اپنی مرضی سے پیدل چل رہا ہوں۔ ایک فرلانگ اور چلا ہوں گا۔ پھر ایک گاڑی میرے قریب رُکی۔ وہ گاڑی کسی ایسے شخص کی تھی جسے میں جانتا نہ تھا۔ انہوں نے بھی لفٹ کی آفر کی۔ میں نے اُن سے کہا۔ صاحب! اللہ نے ہمیں فٹ پاتھ پر چلنے کی آزادی دی

ہے۔ اس لیے مجھ سے میری آزادی نہ چھینیں۔ کیوں طفیل صاحب! میں نے کوئی غلط کہا؟"

"نہیں صاحب سچ کہا۔ خواہ آزادی میں چپیں بول جائے۔"

"ارے طفیل صاحب! نورِ مطلق سے لو لگائیے۔ چلچلاتی دھوپ میں چلنا نفسِ مطمئنہ نہیں تو اور کیا ہے؟ یوں کوئی آبرو میں کمی نہیں ہوتی۔ وُوں کوئی عزت میں بڑھوتری نہیں ہوتی۔ ہر شاہ مجھ گدا سے کمتر ہے۔"

"سبحان اللہ!"

"ذرا سُنیے نفسِ مطمئنہ والے بندے ہوتے کیسے ہیں؟"

"فرمائیے۔"

"کراچی میں بڑے اُونچے پیمانے پر ہماری تصویروں کی نمائش ہوئی۔ لوگ میری تصویریں خریدنا چاہتے تھے۔ منتظم نے کہا "صادقین آجاؤ۔ تصویریں بِک رہی ہیں"۔ مگر میں اُس وقت ایک صاحب سے محوِ گفتگو تھا۔ میں نے گفتگو کو بیچ میں چھوڑنا خلافِ اخلاق سمجھا۔ بات مکمل کرنی چاہی۔ ابھی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ وہ مجھے کھینچ کر لیجانے لگے۔ ساتھ ہی کہا "لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی معاملت ہے۔ وہ کئی تصویریں خریدنا چاہتے ہیں۔ اس پر میں نے اُن سے (منتظم سے) کہا "کیا تم اُن سے یہ نہیں کہہ سکتے۔ صادقین اپنی تصویریں بیچنا نہیں چاہتے۔"

"اچھا جی!"

ہاں بھائی ہاں! مجھے NOT FOR SALE کہنے میں زیادہ مزا آتا ہے۔ مجھے پیدل چلنے میں زیادہ مزا آتا ہے۔ دل غنی ہونا چاہیئے۔ اللہ نے ایک غنی دل دیا

ہے۔ میں تو اپنے پروردگار کا شکر گزار ہوں۔ جس نے زمانے کی ترغیبات سے بے نیاز بنایا۔ اُن کی میرے سامنے کیا حقیقت ہے۔ جو دولت کے پیچھے پاگل بنے رہتے ہیں۔ میری دولت میری قناعت ہے۔ میری بے نیازی ہے۔ میرا وہ غرور ہے جو کسی دولت مند کے پاس نہیں۔ میں نے آپ کو اسی موضوع پر ایک رباعی بھی تو لکھ کر دی تھی۔

"وہ! — قسمت نے مجھے پیش کیا تھا کیا کیا!"

"ہاں وہی —!"

قسمت نے مجھے پیش کیا تھا کیا کیا
رد کر کے میں نے لیا تھا کیا کیا
مجھ میں تو تھی اک خوئے قناعت ورنہ
مولیٰ نے تو بندے کو دیا تھا کیا کیا

صادقین کی درویشی اور قلندری کا مجھ پر رعب پڑ رہا تھا۔ سوچنے لگا۔ یہ بندہ تو پہنچا ہُوا ہے۔ باتیں بھی منٹھار منٹھار کے کرتے ہیں۔ بہ ظاہر ان میں بناوٹ بھی معلوم نہیں ہوتی۔ ایک شانِ بے نیازی، وہ بھی ایسی جس میں استغنا کا پہلو زیادہ نمایاں تھا۔ میں نے سوچا۔ ان کی سابقہ آمدنی کے بارے میں پرچول کی جائے تاکہ بات زیادہ واضح ہو سکے۔

میں نے استفسار کیا "صادقین صاحب! آپ نے منگلا ڈیم کی دیوار پر جو تصویر بنائی تھی۔ سُنا ہے کہ آپ نے اس کے اسّی ہزار روپے لیے تھے۔ اُن روپوں کا کیا کیا تھا۔ یعنی اُن میں سے کیا بچایا؟ کیا خریدا؟"

"فقیروں کے ہاں تو اسّی ہزار روپیہ کی رقم، کوئی رقم ہی نہیں ہوتی۔ لینے کے

قابل نہیں ہوتی۔ ہاں پانچ چھ لاکھ روپیہ رقم ہے۔ میں نے روپیہ کا کیا کرنا ہوتا ہے۔ جسے ضرورت ہوتی ہے اُسے دے دیتا ہوں۔ میں تو صرف وسیلۂ محض ہوں۔ خدمتِ خلق کے لیے تو مجھے لاکھوں کروڑوں کی ضرورت ہے۔ پھر یہ قصّہ بھی نہیں "اندھا بانٹے ریوڑیاں اپنوں کو" جو پہلے آگیا اور ضرورت مند ہُوا۔ اُسے دیدیا۔"

"کیا آپ کو کبھی روپیہ کی احتیاج بھی ہوئی؟"

"پیٹ بھرنے کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی ہے مگر میں کئی کئی دن بغیر روٹی کھائے بھی گزار دیتا ہوں۔ محض بھُوکا پیٹ ہونے کی لذّت محسوس کرنے کے لیے۔"

"لذّت؟"

"بات یہ ہے کہ جب قدرت نے سب کچھ دے رکھا ہو اور آپ تفریحاً بھُوکا رہنا چاہتے ہوں یا کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے بھُوکا رہنا چاہتے ہوں تو اُسے میں بھُوک کی لذّت ہی کہوں گا۔ مگر اس سے کبھی کبھی یہ بھی اندازہ ہوا کہ بھُوک کی مار کیسی ہوتی ہے؟"

"باتوں باتوں میں یہ بھی پتہ چلا کہ یہ تقریباً ساری دنیا گھوم چکے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "جب آپ باہر جاتے ہیں تو کیا کیا اہتمام کرتے ہیں؟"

انہوں نے کہا۔ "جیب میں صرف ایک ٹکٹ ہونا چاہیئے۔"

"آخر آپ نے باہر جاکر اتنی نمائشیں کی ہیں۔ اُن کے لیے کچھ تصویریں بناتے ہوں گے۔ کچھ اُن کے ماحول کا خیال رکھ کر، اپنے موقلم کو حرکت میں لاتے ہوں گے۔"

"یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ میں جہاں جاؤں گا وہیں بیٹھ کے سب کچھ بنالوں گا۔ اس سلسلے میں مَیں اپنے ملک پر کبھی بوجھ نہیں بنا۔ لوگ باہر جاتے ہیں۔ اسٹیٹ بینک

سے فارن ایکسچینج لیتے ہیں۔ دوستوں کو بھی جاکر ستاتے ہیں۔ مگر میں جب بھی باہر گیا۔ وہاں کی معیشت کا حصّہ بن کر رہا۔ وہیں موقلم کی طاقت سے روپیہ کمایا۔ وہیں ہم وطنوں میں تقسیم کر دیا۔ خود بھی دو وقت کی روٹی کھالی۔

پچھلے دنوں، جب قیامِ پاکستان کو پچیس برس ہوئے تو پچیس سالہ جشن بھی منایا گیا۔ اس سلسلے میں متعدد تقریبات ہوئیں۔ خوب دھوم دھڑکا ہوا۔ فنونِ لطیفہ کے سلسلے میں فیض احمد فیضؔ، صادقینؔ، روشن آرا بیگم کو ٹیلی ویژن پر بلایا گیا کہ وہ بتائیں کہ پچیس برسوں میں فنونِ لطیفہ نے بھی کچھ ترقی کی کہ نہیں؟ فیض صاحب نے ادب کا جائزہ لیا۔ زیادہ تر اپنی مثالیں دیں۔ انہوں نے کہا۔ جب ہمیں آزادی ملی تو اُس وقت ہماری شاعری میں نااُمیدی کی رو تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے کہا "یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر" پھر جبر و تشدّد کا دَور آیا تو میں نے کہا "خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں مَیں نے" اس کے بعد اب جاکر یہ عوامی دَور آیا ہے۔ اس لیے مجھے اُمّید ہے کہ ادب گھٹن کی فضا سے نکلنے کے بعد، اپنا رول ادا کر سکے گا۔

یوں تو روشن آرا بیگم نے بھی موسیقی کے بارے میں بہت کچھ کہا۔ بدقسمتی سے مجھے آواز کی جادوگری سے زیادہ صورت کی ساحری بھلی لگتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے روشن آرا بیگم سے طاہرہ سیّد زیادہ بڑی فن کار نظر آتی ہیں (خوب) خیر یہ وادی اپنی وادی نہیں۔ اس لیے اس مبحث پر کیوں اپنا وقت ضائع کیا جائے۔ بہرحال جو بھی گائے۔ اُسے خوش شکل ضرور ہونا چاہیئے۔

اصل میں تو مجھے یہاں بات صادقین کی کرنا تھی۔ وہ سر جھکائے کہے جا رہے تھے۔

پچیس برسوں کے اندر، ادب نے کوئی ترقی نہیں کی۔ بلکہ ادب کسی حد تک روبہ زوال ہے۔ لیکن ان برسوں میں فنِ مصوری نے بے اندازہ ترقی کی۔ یہ مَیں نہیں کہہ رہا ہوں۔ اہل الرائے حضرات کا یہی کہنا ہے۔ کئی نئے آرٹسٹ پیدا ہوئے جنہوں نے اس فن کو عظمت کی بلندیوں تک پہنچا دیا اور اُن کی شہرت، گھر سے نکل کر، دنیا کے کونے کونے تک پہنچی۔ یہ میں نہیں کہتا اور دیدہ ور بھی، میری رائے سے متفق ہیں کہ فنِ مصوّری نے عروج پایا ہے اور یہ میں نہیں کہہ ——

جس طرح خم ٹھونک کر، فیض صاحب نے اپنے بارے میں باتیں کی تھیں۔ انہوں نے "میں نہیں کہہ رہا" کی گردان میں اپنے بارے میں واضح انداز اختیار نہ کیا۔ بلکہ گھما پھرا کر سمجھانا چاہا کہ مجھی کو دیکھو، اس فن میں ایک عدد صادقین بھی ہے۔ جو اپنے گھر میں کم لیکن باقی دنیا میں زیادہ پہچانا جاتا ہے۔

صادقین کے اس انٹرویو پر، ایک صاحب نے کہا" صادقین جتنی دیر بھی باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے گردن اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ بہت شرمیلے معلوم ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا:" شرمیلے پن والی بات بھی ٹھیک ہے۔ مگر اُنہوں نے ٹیلی ویژن کی ضرورتوں کو اپنی بے نیازی سے زیادہ عزیز نہ جانا۔ وہ خُوئے قلندری کو، کبھی اور کسی حال میں بھی ترک نہیں کر سکتے۔ جس رَو میں ہوں گے اُسی رَو میں بات کریں گے۔ انہیں کوئی سلیقہ سکھا نہیں سکتا اور، نہ وہ کسی کے سلیقے کو، اپنے لیے وجۂ تقلید سمجھتے ہیں۔"

اب لگے ہاتھوں ذرا شرمیلے پن کی بھی بات ہو جائے۔ لاہور سے انہیں والہانہ عشق ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر ملک اور ہر شہر کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس کی آب و ہوا میں کچھ اوصاف

ایسے ہوتے ہیں جو اُسی شہر سے مختص ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے کہا۔ جرمنی میں موسیقار پیدا ہوئے۔ فرانس میں نقاش اور انگلستان میں شاعر — اور لاہور! — مصوّری اور خطّاطی کا مرکز ہے۔ جہاں محبّت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ وہیں فن بھی پروان چڑھتا ہے۔ کراچی سرمایہ داروں، دکانداروں اور سمگلروں کا شہر ہے۔ لاہور شاعروں، ادیبوں اور محبّت کرنے والوں کا شہر ہے۔

پھر وہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹھکے۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ مگر کہہ نہ پا رہے ہوں۔ میں نے کہا۔" وہ بات بھی کہہ دیجئے جو کہہ نہیں پا رہے "۔

کہنے لگے " جب میں لاہور پہنچا تھا تو اُس وقت میری جیب میں ایران اور استنبول کے ٹکٹ رکھے تھے۔ اگر میں لاہور نہ پہنچتا تو بیروت کی نائٹ کلبوں میں بیٹھا ہوتا یا بحیرۂ روم کے کسی جزیرے میں دادِ عیش دے رہا ہوتا۔ رنگ برنگی شرابوں سے کام و دہن کی پیاس کو آسودہ کر رہا ہوتا۔ مگر —"

لفظ مگر کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گئے۔ میں نے کہا۔" جو بات آپ کہنا نہیں چاہ رہے وہ میں سمجھ گیا ہوں۔ لہٰذا کہہ ڈالیے "۔

میں نے سوچا " نوجوانانِ قوم اور دخترانِ قوم کے درمیان اپنا وقت گزارا جائے۔ چونکہ اُن دنوں جنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ اس لیے لاہور چلا آیا تھا۔ لہٰذا —"

اب لہٰذا کے بعد اٹک گئے۔ میں نے کہا۔" جناب! بات پوری کیجئے اور میرے لاہوری ہونے کا کچھ خیال نہ کیجئے "۔

بات یہ ہے کہ میں مصوّر ہوں۔ حُسن پرست ہوں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کو خوبصورت

چیزیں پسند ہیں۔ اُسی طرح مجھے بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میراجی چاہتا ہے۔ جس طرح بھی ہو میرے شب و روز مہ وشانِ لاہور کے درمیان گزریں۔"

یہ کہنے کو تو کہتے ہیں کہ میراجی چاہتا ہے کہ میرے شب و روز لاہور میں گزریں۔ مگر ان کا ایک واقعہ کراچی کا ضرور سُن لیں۔

جن دنوں یہ ہسپتال میں تھے۔ اُن دنوں اُن سے روز ملاقات ہوتی تھی کیونکہ انہی دنوں جناح ہسپتال میں حفیظ ہوشیارپوری، فضل احمد کریم فضلی بھی زیرِ علاج تھے۔ یوں جب دو تین دوست ہسپتال میں ہوں تو قدم بے اختیارانہ بھی اُدھر اُٹھ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک نرس انہیں انجکشن لگانے کے لیے آئی۔ انہوں نے کسی کا نام لے کر پوچھا "وہ کہاں ہے؟"

"چھُٹی پر ہے۔"

"تو پھر انجکشن لگانے کی کیا ضرورت ہے؟"

دوسرے دن وہی نرس انہیں انجکشن لگانے آگئیں جس کا کہ یہ ایک دن پہلے پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنا بازو ننگا کرتے ہوئے کہا "اچھا ہوا کہ آپ آگئیں۔"

"جی!"

"یہ میں زندگی میں دوسرا انجکشن لگوا رہا ہوں۔"

"زندگی میں کل دو انجکشن لگے؟"

"جی ہاں!"

"تیسرا انجکشن تو اس ہسپتال میں بھی ہو گیا۔"

"کل جو مجھے انجکشن لگا تھا اُسے میں اپنی زندگی میں شامل نہیں سمجھتا۔"

یہ ایسی موہنی گفتگو کرتے ہیں کہ ذرا سا بھی نشیب ہو تو آدمی پھسل پڑے۔ چونکہ ان کے لہجے میں نرمی اور تیوروں میں خلوص ہوتا ہے اس لیے ہر کوئی سنبھل نہیں سکتا۔ یہ حسنِ اخلاق سے کام لیں گے۔ حسنِ کلام سے بھی اور حسنِ سلوک سے بھی۔ اس کے باوجود ان کی عیاشی زبانی کلامی ہوتی ہے "سچے عشق" والی کوئی بات نہیں۔ پھر ان کا معیار بھی دوسروں سے مختلف ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج حُسن کا معیار یہ ہے کہ قد اتنا ہو۔ چھاتی اتنی ہو۔ کمر اتنی ہو۔ چلو جسم کو تو ناپ تول لیا مگر ادائے ناز، مسکراہٹ، نخروں اور عشوہ طرازیوں کو کس فیتے سے ناپیں گے؟"

یہ ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتے ہیں۔ یعنی شاعری کا دورہ پڑے تو شاعری، خطّاطی کی دُھن سوار ہو تو خطّاطی، مصوّری کا موڈ ہو تو مصوّری! یہ بیک وقت مصوّری، خطّاطی اور شاعری پر ہاتھ صاف نہیں کر سکتے۔ پھر آمد کا عالم یہ ہوگا کہ تصویروں پہ تصویریں بنیں گی، خطّاطی پہ خطّاطی ہوگی۔ شاعری پہ شاعری ہوگی۔ بالکل ایسے ہی جیسے پیڑ پر سیب آتے ہیں۔

ہسپتال ہی میں، ان کے پاس کاغذ، سیاہی اور قلم رکھا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔

"یہ رہا کاغذ، اب قلم پکڑ لیجئے۔"

"خیر باشد؟"

"جس طرح شاعر فی البدیہہ شعر کہتا ہے۔ اُسی طرح آپ بھی فی البدیہہ تصویر بنائیں مگر ان تصویروں کا موضوع آپ کی ذات اور آپ کا فن ہونا چاہیئے۔"

"یہ قلم تصویر بنانے کے قابل نہیں۔"

"پھر بھی بنائیے۔"

"یعنی آج آپ زبردستی پر تُلے ہوئے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ آپ سے زبردستی کوئی بھی کام نہیں کرایا جاسکتا۔ بس ایسے ہی ضد کر بیٹھا ہوں۔ لہٰذا لاج رکھ لیجئے۔"

"دوستوں کی خاطر جان بھی دی جا سکتی ہے۔ آپ کا مطالبہ تو چند لکیروں کا ہے۔"

"جی ہاں فقط!"

"لیجئے صاحب قلم پکڑ لیا۔ یہ رہے صادقین، کانٹوں میں اُلجھا ہوا۔ یہ رہا پھُول، اب اس تصویر کی تفسیر میری ایک رباعی ہے۔ وہ بھی لکھ دوں؟ تاکہ بات زیادہ واضح ہو سکے۔"

"ضرور! ضرور!"

وہ رُباعی یہ ہے :۔ (دہرا بھی رہے ہیں۔ لکھ بھی رہے ہیں)

ہر چند کہ نازوں کا پلا ہوا ہوں اے دوست
مَیں آبلہ پا ہوں، دل جلا ہوں اے دوست
کھِلتے ہوئے اک پھُول کا جلوہ کرنے
کانٹوں پہ کئی کوس چلا ہوں اے دوست

اب جب قلم پکڑ ہی لیا تو ایک تصویر اور سہی!

بہت اچھا۔ یہ رہے صادقین، ان کے ہاتھ میں قلم ہے۔ بغل میں تختی ہے اور صادقین کے قدموں میں تاج پڑا ہے۔ اس خیال کو شعروں میں یوں ادا کیا :۔

دشمن کو دی دام و درم کی دولت
اور ہم پہ بکھیر دی کرم کی دولت
دی اتنی سمیٹے سے سمٹتی ہی نہیں
مولا نے ہمیں دی لوح و قلم کی دولت

"بہت خوب!"

"اگر کوئی ہمیں یہ کہہ دے کہ آپ کو اس مملکت کا بادشاہ بنا دیں گے مگر شرط یہ ہے کہ قلم کو ہاتھ نہ لگانا تو ہم ایسی بادشاہت کو ٹھکرا دیں گے۔ اسی خیال کو ہم نے یوں نظم کیا ہے۔

گر ترکِ محبّت کی جزا ہیں توڑے
گر جرمِ محبّت کی سزا ہیں کوڑے
کوڑے ہمیں منظور ہیں، ورنہ دل میں
سرطانِ جمود کے سڑیں گے پھوڑے

"اب لیجئے تصویر بھی بنائے دیتا ہوں۔ یہ رہا طاقت کا سمبل جس کے ہاتھ میں کوڑا ہے۔ یہ رہا صادقین جس کے جسم پر کوڑوں کے نشان ہیں۔ یہ رہی تصویر، جس کے بنانے کی خاطر، صادقین مجروح ہوا۔"

میں نے کہا، "یہ تصویریں، آپ کے خیالات کی تو ترجمانی کرتی ہیں مگر آپ نے انہیں اتنی جلدی بنا ڈالا کہ ان کے خطوط میں مزید نکھار پیدا ہو سکتا ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ان تصویروں کا درجہ وہی ہے۔ جیسے علاّمہ اقبال پر شعر نازل ہو رہے ہوں اور وہ پنسل پکڑ کر جلدی جلدی کاغذ پر لکھے جا رہے ہوں۔ یہ کام بعد کا ہے کہ

کوئی کاتب انہیں خوشخط لکھے یا خود علامہ انہیں بنا سنوار کے لکھیں۔ اصل چیز جو کچھ ہے۔ وہ جذبہ اور خیالات ہیں جنہیں صفحۂ قرطاس پر لانا ہی سب کچھ ہوتا ہے۔"

باتوں باتوں میں یہ بھی پتہ چلا کہ وہ آئندہ چند ایک کاموں میں ضرور دلچسپی لیں گے۔ اُن میں ایک کام قائدِ اعظم کے مزار پر خطاطی کا ہے۔ دوسرا موہنجوڈارو میں کچھ مجسمے بنانے کا ہے۔ تیسرا لاہور میوزیم میں پوری چھت پر پینٹنگ کا۔ اس کے بعد شاید بیرون ملک جائیں کیونکہ یہ ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے اپنے ملک کا حق ادا نہیں کیا۔ یہ کچھ کر گزرے تو ان کے خیال میں پھر ملک چھوڑتے ہوئے انہیں ان کا ضمیر ملامت نہیں کرے گا۔

کوئی چیز حسین لگتی ہے تو اُسے ناپا اور تولا نہیں جا سکتا۔ یعنی اگر کوئی عورت خوبصورت ہو تو اس کا یوں تجزیہ نہ کریں گے کہ اُس کی ناک اچھی ہے یا یہ کہ اس کی آنکھیں اچھی ہیں۔ اور نہ یہ کہ اس کا رنگ اچھا ہے بلکہ ہم مجموعی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ یہ حال نہ صرف مہ جبینوں کا ہے بلکہ ندا اور شخصیتوں کا بھی ہے خواہ وہ کتنی ہی جہتوں سے کیوں نہ بکھری پڑی ہوں۔

اِن دنوں جب مَیں، ان سے آخری بار ملا تو یہ چند حسیناؤں میں گھرے بیٹھے تھے۔ مَیں چند منٹ ٹھہر کر، ان کے فقرے دہراتا ہوا چلا آیا کہ "مَیں عاشق نہیں —— حُسن پرست ہوں —— میں نے کسی خاتون کو جی کا جنجال نہیں بنایا ——

بس اتنا ہے جہاں منظر اچھا ہو۔ وہیں ذرا اُونگھ جاتا ہوں۔"

مَیں صادقین کو دیکھتا ہوں تو یہ سوچتا ہوں کہ اس دنیا میں ہر چیز روپیہ دیکر نہیں خریدی جا سکتی کیوں کہ اس عجیب بازار میں بعض چیزیں ایسی بھی فروخت ہوتی ہیں۔ جو مفت ملتی ہیں یا بالکل نہیں ملتیں۔



کوثر نیازی

[یہ مضمون، مولانا کوثر نیازی کی کتاب
"زرِ گل" کی افتتاحی تقریب کے موقع پر پڑھا گیا]

ہمارے کئی دوست، دیکھتے دیکھتے وزیر ہو گئے اور ہم اُن کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ مجھے اس بات کا غم نہیں کہ کوثر نیازی وزیر کیوں ہو گئے۔ غم اس بات ہے کہ اچھا بھلا دوست تھا جو وزیر ہو گیا۔

لوگ مولانا کوثر نیازی کو جانتے ہیں۔ مَیں محمّد حیات خاں کو جانتا ہوں۔ میرے اور دوسرے کے مضمونوں میں جو چکر پڑے گا وہ یہی چکّر ہو گا۔ آپ جو کئی مضمون مولانا کوثر نیازی کے بارے میں سُنں گے۔ اُن میں ایک مضمون محمّد حیات خاں کے بارے میں بھی سُن لیں تاکہ ان میں جو بشریّت کی شان ہے اُسے کوئی ضعف نہ پہنچے۔

ایک دن میں اپنی للک میں بیٹھا تھا کہ ایک نسوانی آواز نے مجھ سے یہ کہا "مولانا کوثر نیازی کے بارے میں ایک تقریب ہو رہی ہے۔ آپ بھی اُن پہ کچھ لکھیں۔"

میرا مؤدبانہ جواب یہ تھا۔" بی بی! وہ کوثر نیازی جو ہمارے دوست تھے اور اِس کوثر نیازی میں جو وزیر ہیں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ ہمارے دُکھ درد میں شریک تھے۔ یہ قوم کے دُکھ درد میں شریک ہیں۔ پہلے اُن کے پاس جتنا خلوص تھا وہ ہمارے لیے تھا۔ اب یہ اُتنے ہی خلوص میں پوری قوم کو رجھا رہے ہیں۔

جہاں تک خلوص والے مسئلے کا تعلق تھا۔ اُسے میرے ذہن نے فوراً حل کر دیا کیوں کہ لوگ دُودھ میں جتنا چاہتے ہیں پانی ڈال دیتے ہیں۔ میرے نزدیک دودھ اور خلوص میں زیادہ فرق نہیں۔ جتنا چاہیں بڑھا لیں۔

کسی پیاری شخصیت کا ذکر، جب یوں اچانک چھڑ جاتا ہے تو پھر ذہن میں دوستانہ مراسم کی ریل سی چلنے لگ جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ مولانا کے گھر، دری پہ بیٹھے کباب کھا رہے ہیں اور مولانا کبابوں کی اہمیت پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ بیمار ہوا تو مولانا مزاج پرسی کے لیے آ رہے ہیں اور ڈاکٹر کی غلط تشخیص پر ناراض ہو رہے ہیں۔ غزل نمبر کا نیا ایڈیشن چھپا تو مولانا فرما رہے ہیں۔ ذرا سنبھل کے رہنا۔ اب کے تمہیں بہت سی لڑکیوں کے خطوط آئیں گے۔ اسی کتاب " زرِ گل" کا جب پہلا ایڈیشن چھاپنے کے لیے دیا تو زبان سے یہ کہا۔ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے اُٹھے۔ غرض مولانا بڑے پیارے آدمی تھے۔ عالم کے عالم، یاروں کے یار! حالانکہ اس کلجگی دَور میں جو عالم ہے وہ کسی کا یار نہیں۔ کیوں کہ علم، عمل کو آواز دیتا ہے۔ اگر عمل جواب دے تو ٹھہر جاتا ہے۔ ورنہ کوچ کر جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے دھیان اور پھسلا تو یہ بھی دیکھا کہ ۱۹۵۳ء میں جب ان

کی شادی ہوئی تو یہ گرفتار ہو گئے۔ اب ۱۹۷۱ء کے الیکشن میں جب یہ گرفتار ہوئے تو وزیر بن گئے۔ گویا گرفتاری کے ساتھ ساتھ، کسی نہ کسی اہم واقعہ کا، ان کی زندگی سے گہرا تعلق ہے لیکن اب ان کا مقدر بدل چکا ہے۔ اب اہم واقعات کا تعلق، ان سے متعلق ہو کے رہ گیا ہے۔ گرفتاریوں کا تعلق، دوسروں سے متعلق ہو گیا ہے۔

ذہن جب ایک بار بھٹک جائے تو بھٹکتا ہی چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ذہن کی سکرین پر دیکھا کہ مولانا وجیہہ ہیں، شکیل ہیں۔ پھر ادیب ہیں۔ خطیب ہیں ـــــ اور مولانا شاہ عالم مارکیٹ کی ایک مسجد میں درس دے رہے ہیں۔ لوگ تقریر سے متاثر ہو رہے ہیں۔ جھُوم رہے ہیں۔ پھر ایکا ایکی مولانا مذہب سے سیاست کی طرف نکل گئے اور مجھے ان سے یہ کہنا یاد نہ رہا کہ جب مذہب کا نام لے کر سیاست کے گھوڑے دوڑتے ہیں تو سب سے پہلے مذہب ہی کی لگام کو توڑ دیتے ہیں۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ ان کے عہد میں مذہب پر کیا گزری؟ اس لیے کہ آج سُرابوں میں حقیقتوں سے زیادہ دلکشی پیدا کر دی گئی ہے۔ اپوزیشن والے کہتے ہیں ملک ہمارے دم سے ہے۔ برسرِ اقتدار پارٹی کہتی ہے۔ ہم نہ ہوں گے تو یہ ملک بھی نہ ہو گا۔ ہم سب اپنی اپنی مسجد کے عالیشان گنبد کو تو دیکھ رہے ہیں مگر اس سے جو آواز آ رہی ہے۔ اُسے کان لگا کر نہیں سُن رہے۔

سُنا ہے کہ دنیا کی عمارت کے چار ستون ہیں ـــــ وہ علم جو علما کے سینے میں ہو ـــــ وہ عدل جو ارکانِ حکومت کے ارادوں میں پایا جائے ـــــ وہ دُعا جو صالحوں کے دلوں سے نکلے ـــــ اور وہ جلال جو بہادروں کے تیور سے ظاہر ہو۔

اِس کلیہ کے اعتبار سے بھی، ان ستونوں پہ جو عمارت کھڑی ہے۔ اُن میں مولانا

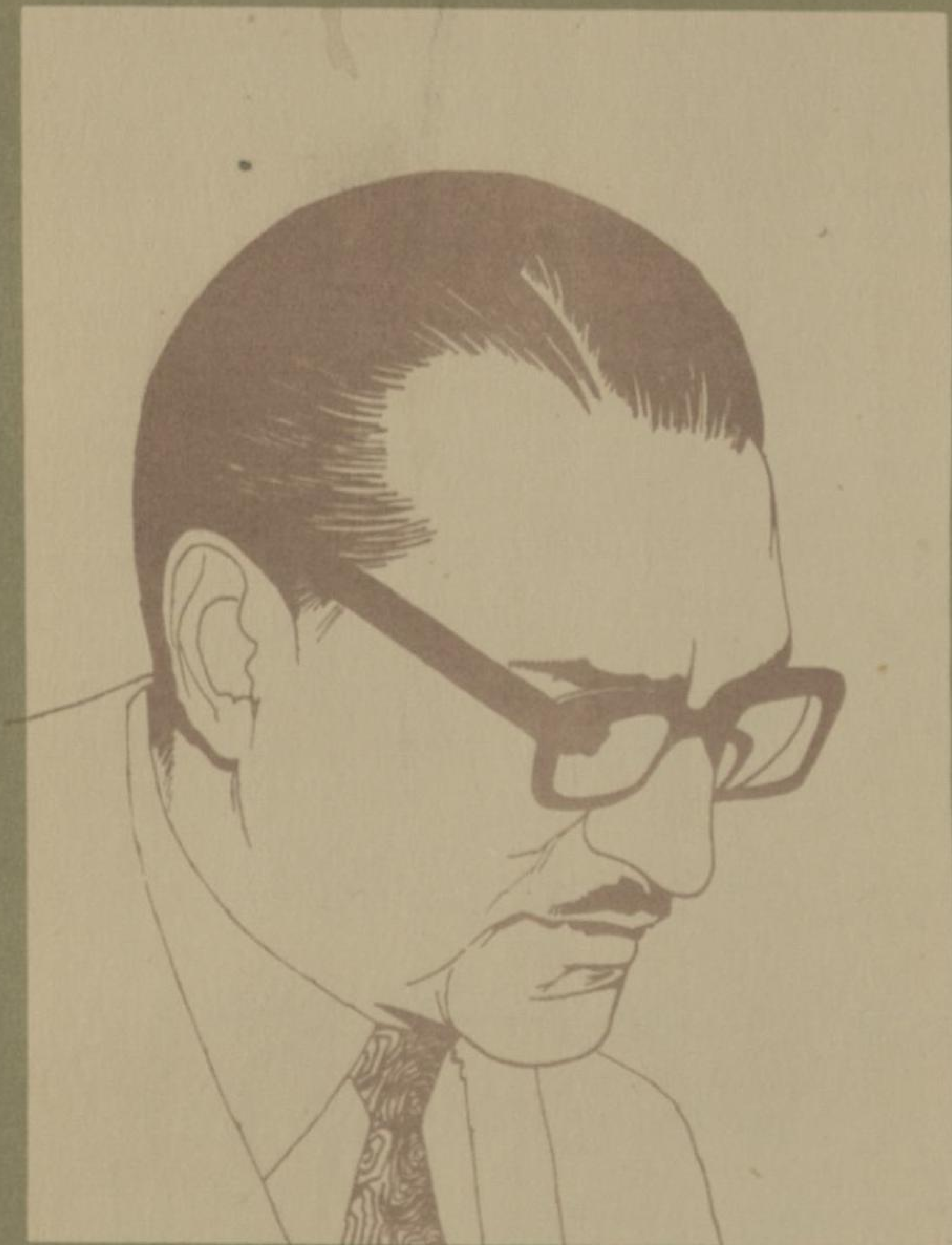
کے کندھوں کا سہارا بھی شامل ہے۔ بوجھ ان کے کندھوں پہ کتنا ہے۔ میرے لیے یہ سوال قابلِ غور نہیں۔ میرے نزدیک مسئلہ، نیّت کے ثواب میں شرکت کا ہے۔

آج جو ہم یہاں جمع ہوئے ہیں تو یہ بتانے کے لیے کہ انسان جو ماضی کی روایات کا وارث ہے وہ کتابوں ہی سے اپنی وراثت حاصل کرتا ہے اور کتابیں ہی اس کی وراثت کی دستاویز ہوتی ہیں۔ آج مولانا کوثر نیازی بھی، اپنے ورثہ میں ایک دستاویز کا اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ کتاب شعری مجموعہ پر مشتمل ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شاعر کے الفاظ سے ترنم پیدا ہوتا ہے۔ میری گزارش یہ ہے کہ اُس کی رُوح کے ترنّم سے الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔

میں ایسی باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ اُسی نسوانی آواز نے ٹھوکا دیا "آپ کا وہ دوست جو آپ کے نزدیک کھو گیا ہے۔ کیا آپ انہیں ڈھونڈھنے کے لیے بھی نہیں آسکتے"

میرا جواب یہ تھا "بی بی! میں انہیں کیسے ڈھونڈ سکتا ہوں۔ اس لیے کہ یہ خاکسار وزیروں اور سفیروں سے دُور بھاگتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ان دنوں، وزیر اور سفیر عوام سے بھاگنے لگے ہیں"

دعویٰ مولانا کا بھی یہ ہے کہ میں عوام کے قریب ہوں۔ دعویٰ میرا بھی یہ ہے کہ میں مولانا کے قریب ہوں۔ خُدا آبرو ان کی بھی رکھے۔ خُدا آبرو میری بھی رکھے۔



مختار مسعود

یہ مختار بھی ہیں۔ یہ مسعود بھی ہیں۔ لہٰذا میں بھی سوائے اس کے اور کیا کہوں کہ اللّٰھم زد فزد، یوں اگر ان کا ذکرِ خیر چلے گا تو دونوں ہی طرح سے چلے گا۔ میں حضرت موسیٰؑ کی طرح صرف ایک لفظ " ارنی" کہہ کر اپنا گزارہ نہیں کرسکتا۔ میں تو گنہگار ہوں اسی لیے مجھے اپنا مدّعا بیان کرنے کے لیے صفحوں پہ صفحے لکھنا پڑیں گے۔ اس پر بھی مَیں، ان کی تھوڑی سی مختاری اور تھوڑی سی ہی مسعودی کا ذکر کرسکوں گا۔ بات تھوڑی اور ادھوری کیوں ؟ مجبوریاں ہیں صاحب! کیوں کہ موصوف غلافوں کے اندر رہتے ہیں یہ جتنے عیاں ہیں اس سے زیادہ نہاں ہیں۔ پھر انھوں نے جو غلاف اوڑھ رکھے ہیں، اُن کے شیڈ بھی مختلف ہیں اور دبازت بھی جُدا جُدا !

جب مجھے مسعود نے اپنی پہلوٹھی کی تصنیف " آوازِ دوست" دی تو مَیں مارے خوشی کے انار کی طرح سُرخ ہوگیا۔ جب انھوں نے مجھے مضمون لکھنے کے لیے کہا تو

میرا رنگ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ چند دن گزرنے کے بعد، جب میں نے اُس سُرخی اور سفیدی کو باہم پھینٹا تو پھر جو نتیجہ نکلا وہ متعدد " ہوائیوں "، کی صورت میں، آپ کے سامنے موجود ہے ہر چند کہ میں مسعود کا دشمن نہیں ہوں۔ اس کے باوجود میں اپنی باتوں کو ہوائیوں سے زیادہ درجہ دینا بھی نہیں چاہتا۔

مسعود کے سلسلے میں، میرے ذہن کے کونے کھدروں میں جو کچھ بھی دبکا اور چھپا ہوا ہے اُسے ڈھونڈھ اور کھوج کر آپ کے سامنے لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ حافظہ بجھا ہوا ہے اور شوق فراواں ہے کیوں کہ عہدِ عقل کو بیتے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ جوانی میں حوصلہ زیادہ ہوتا ہے۔ اچھی باتیں زیادہ یاد رہتی ہیں۔ ادھیڑ عمر میں تلخیوں کی طرف زیادہ جھکاؤ ہوتا ہے۔ سیدھی باتوں کو بھی ٹیڑھے انداز میں، کہنے کو جی چاہتا ہے۔ غرض ایک ہی آدمی زندگی میں چار بار بدلتا ہے۔ انسان کا بچپنہ کچھ کہتا ہے۔ جوانی کچھ اور ڈھنگ سے نچاتی ہے۔ ادھیڑ عمر میں کچھ زیادہ ہی سود و زیاں کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ بڑھاپے میں جا کر " مجھے نہ چھیڑو " کی تصویر بن جاتا ہے۔ الحمد للہ کہ ابھی مجھ پہ وہ وقت نہیں آیا۔ ابھی تو مجھ میں دوسروں کو چھیڑنے کی ہوس باقی ہے۔

مضمون شروع کرنے سے پہلے ایک بات اور کہہ دوں تاکہ میرا مضمون گھپلے بازی سے نکل سکے۔ وہ یہ کہ بندہ ابھی سلوک کی پہلی منزل میں ہے جہاں علم میں حق سے پہلے باطل کا درجہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس مضمون کے سلسلے میں میرا زیادہ تر واسطہ باطل ہی سے پڑے۔ یوں ہوا تو حق کی بات کوئی اور اللہ کا بندہ کرے گا۔ غرض میرا یہ مضمون ان کے مزاج اور میرے افکار ہی کی طرح ٹیڑھا ہوگا۔ مجھے ان کے مزاج کی نہیں، اپنے دماغ

کی ٹیڑھ کی فکر ہے۔

مَیں مسعود کے ذکر سے پہلے ان کے والدِ محترم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ ماحول اور تربیّت کے اثر سے بھی شخصیّت کے پرت کھُلتے ہیں۔ وہ جو مسعود نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہر اچھے آدمی کے گرد ایک ہالہ ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک جائیں تو دل خود بخود منوّر ہو جاتا ہے۔" وہ کسی اور شخص کے بارے میں سچ ہو یا نہ ہو انکے والد کے بارے میں ضرور سچ ہے۔ جو بھی ملا گرویدہ ہو کر اُٹھا۔ جس سے بھی واسطہ پڑا وہ فریفتہ نکلا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے میں جن کتابوں کا دلدادہ تھا۔ اُن میں علی گڑھ کے ایک استاد شیخ عطاالله کی کتاب "اقبالنامہ" بھی تھی۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مسعود کے والدِ بزرگوار تھے۔ ایک دن مَیں مسعود سے ملنے گیا تو ان سے ملاقات ہو گئی۔ اُن کی صورت اگر شرافت کا مجسمہ تھی تو گفتگو حلم کا نقطۂ عروج، پہلی ملاقات میں متاثر ہوا۔ دوسری میں مُرید ہو گیا۔ عجیب موہنی تھی اُن کی شخصیّت میں!

خُو بُو کے اعتبار سے، یہ بھی اپنے والد کا عکس ہیں۔ فرق اتنا ہے وہ نیکیوں میں عمر رسیدہ تھے۔ یہ ابھی نوجوان ہیں۔ وہ سراپا عجز تھے۔ یہ ابھی اپنی طبیعت کی شعلگی سے نپٹ رہے ہیں۔ اٹھان وہی ہے۔ ویسے اخلاق کی اُسی مسند پر، بیٹھنے کا چاؤ، ان میں بھی پکڑا گیا ہے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، وہ جملہ کسی اور پر کسا جا سکتا ہو یا نہ کسا جا سکتا ہو۔ ان پر ضرور کسا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ پانچویں جماعت کے طالبعلم

ہیں - ان کے گھر میں ایک چینی مسلمان عالم محمد ابراہیم شاکیوچن آتے ہیں - انہوں نے اُن سے آٹوگراف لیے - آٹوگراف بُک کا ایک صفحہ بھر گیا - جب دوسرے صفحے کے لیے انہوں نے آٹوگراف لینے کے بارے میں سوچا تو انہوں نے اپنے اُس وقت کے تاثرات کا ذکر، اپنی کتاب کے صفحہ باون پر یوں کیا ہے :

"جونہی میں نے دوسرا ورق اُلٹا اور سوچنے لگا کہ اب کس کے آٹوگراف لیے جائیں تو بات ہاتھ سے نکل گئی - میں نے والدِ محترم سے رہنمائی چاہی تو ہدایت ملی کہ آٹوگراف البم کے صفحات ہوں یا زندگی کا ورق سادہ، انہیں یونہی نہیں بھرنا چاہیئے - جاؤ نگہِ انتخاب کو کام میں لاؤ - بڑے آدمی زندگی میں کم اور کتابوں میں زیادہ ملیں گے - ان سے تعارف کے لیے کارلائل سے مدد مانگو، ان سے ملاقات کے لیے پلوٹارک کے پاس جاؤ - ان کو سمجھنے کے لیے سعدی سے لے کر سیمو سمائل تک سب کے دروازے پر دستک دو -"

چشمِ بد دُور! بات اگر صرف طرزِ انشا کی ہوتی تو بندہ ان کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتا - لیکن میرے ذہن میں یہ بات نہیں بیٹھ رہی کہ یہ پانچویں جماعت میں بھی کارلائل سے لے کر سیمو سمائل تک کو سمجھتے تھے - اگر واقعی سمجھتے تھے تو مجھے یہ بات کہنے دیجئے کہ پھر انہوں نے چھٹی جماعت میں داخلہ کیوں نہیں لیا؟ ایک یہ علم کے جویا ہیں کہ جو پانچویں جماعت میں بھی اتنے عالم تھے - ایک ہم علم کے ندیدے ہیں کہ جنہیں آج تک اتنا بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ سب کے سب مرد تھے یا عورتیں ہیں -

اصل میں مجھے یہ مضمون پڑھنے سے پہلے دو چار ڈھکانے کے قصیدے پڑھ لینا چاہیئں تھے ۔ کیونکہ آج سے پہلے قصیدہ لکھنا ایک باقاعدہ فن تھا۔ جس میں کئی شعراء نے نام پیدا کیا ۔ وہ فردوسی ہوں کہ قاآنی ، غالب ہوں کہ ذوق، سبھی نے اپنے اپنے جوہر دکھائے ۔ اب نہ ویسا دَور ہے اور نہ ویسے ادیب، آج کل تو سب کارگزاری پر گزارہ ہے اگر کوئی بر بنائے استحقاق کسی کی تعریف کر بھی دیتا ہے تو سب ہکّا بکّا رہ جاتے ہیں ۔ بے شک دنیا میں وسیع النظری اور رواداری کا رجحان بڑھ رہا ہے ۔ مگر ہے وہ صرف اپنے عیبوں سے متعلق !

قصیدہ لکھنا میرے بس کی بات نہیں ۔ اصلیدہ پڑھ سکتا ہوں ۔ وہ بھی اس دھڑکے کے ساتھ کہ کہیں ممدوح اور سامعین دونوں ہی بدمزہ نہ ہو جائیں ۔ بہرحال ۔

پچھلے دنوں اس کتاب کے بارے میں ایک جلسہ راولپنڈی میں ہوا ۔ میں نے سُنا ہے کہ اُس میں بھی، اس کتاب کے بارے میں چھت پھاڑ قسم کی تعریفیں ہوئیں ۔ بے شک یہ کتاب تعریف کے قابل ہے ۔ جتنا چاہیں جھوٹ بول لیں ۔ جتنا چاہیں سچ بول لیں ۔ دونوں چکّر چل جائیں گے ۔ یہ گنجایش میں نے یا تو مولانا محمدؔ حسین آزاد کی کتاب "آبِ حیات" میں دیکھی یا پھر مختار مسعود کی کتاب "آوازِ دوست" میں ، کوئی کہتا ہے ۔ پچھلے پچاس برس میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی ۔ کوئی کہتا ہے آئندہ سو برس میں ایسی کتاب نہیں لکھی جائے گی ۔ ایسے خدشے میری صحت کے لیے بھی مفید ہیں ۔ ان کا طرف دار جو ٹھہرا ۔ اس پر مجھے چینی وزیر دفاع کی وہ بات یاد آگئی جو انہوں نے کچھ یوں کہی تھی کہ اب اگر جنگ ہوئی تو ساری دنیا ختم ہو جائے گی اور اگر اس دنیا میں کسی متنفس

کا وجود برقرار رہا تو وہ کوئی چینی ہوگا۔ اس ضمن میں میری طرف سے اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ اُس چینی کے ہاتھ میں جو کتاب ہوگی وہ "آوازِ دوست" ہوگی!

جب پچھلے دنوں اس تقریب کا پروگرام بن رہا تھا تو سوال پیدا ہوا کہ موصوف کی شخصیت پر لکھے گا کون؟ اِدھر اُدھر دیکھا گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کی وجہ یہ تھی کہ ایک بار خود مسعود نے کہا تھا کہ "ہماری شخصیت پر کوئی کیا لکھے گا۔ اس لیے کہ ہم نے تو کسی کو قریب آنے ہی نہیں دیا۔" بات سچّی تھی اور سچّی ہے۔ کیونکہ اُن کی شخصیت ایک ایسے طلسماتی قلعہ کی سی ہے جو ہے تو عظیم مگر اُس میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ مَیں بھی تو ان کی بارگاہ میں تھوڑے سے خلوص اور زیادہ تر ارادت بالجبر سے پہنچا ہوں۔ اپنایت کی اس ارادی حرکت پر کبھی کبھی خوش ہو لیا کرتا ہوں اور کبھی کبھی متحیر رہ جاتا ہوں۔ البتہ مغموم نہیں ہوتا۔ یہ جادو مختار مسعود کی شخصیت کا ہے۔

سہاگنیں جب بن ٹھن کے اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھتی ہیں تو وہ اپنے آپ پر واری نثاری ہونے کے بعد، گال پر ایک کالی سی بندی بھی لگا لیتی ہیں تاکہ خیریت گزرے۔ چونکہ مسعود نے بھی ادب کے میدان میں الفاظ کی دھنک کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس لیے کسی نہ کسی کا بندی لگانا بھی ضروری تھا۔ سو وہ کام اس خاکسار نے کر ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون کتاب پر کم اور صاحبِ کتاب پر زیادہ تر ہے۔ کیوں کہ میرے نزدیک فساد کی نہیں، بنائے فساد کی اہمیّت ہے۔

مسعود دوسروں کی تعریف کم کرتے ہیں۔ اپنی تعریف سُن کر زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ معاملہ خسّت کا نہیں۔ احتیاط کا ہے۔ احتیاط ان کی زندگی پر اس قدر حاوی ہو چکی ہے

کہ وہ اب عیب کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اگر ان کے ہاں سے اس نوع کی خوشی ملے گی تو وہ بھی بالواسطہ، براہِ راست نہیں۔ مثلاً انداز یہ ہوگا کہ طفیل کے لیے تو نہیں البتہ نقوش کیلئے پندرہ بیس منٹ نکالے جا سکتے ہیں۔ یعنی یہ کسی وقت بھی آسمان سے زمین پر نہیں اُترتے۔ انہیں اپنے جُملوں کی نُدرت سے غرض ہے۔ کسی کے جذبات سے نہیں۔ جو انہیں قریب سے نہیں جانتے۔ وہ ان کی جُملہ بازی سے پریشان بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کے دل میں کچھ ہوتا ہے۔ زبان پر کچھ، ان کی زبان سے شکایت ہو سکتی ہے۔ ان کے دل سے نہیں۔ کیوں کہ وہ بہت تربیّت یافتہ ہے۔ ویسے آج کل یہ خود نمائی کے بعد، خودشناسی کی منزل میں ہیں۔ لیکن خود رفتگی کی منزل آئے گی ضرور!

یہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ اس لیے کہ افسروں کو افسر نہیں سمجھتے اور ادیبوں کو ادیب نہیں سمجھتے۔ اَنا کے اس بادشاہ کی یہ ادا دیکھئے کہ رشید احمد صدیقی ایسا ادیب، ابھی پاکستان کے مقدّر میں نہیں ہوا۔ اُنھوں نے موصوف کے مضمون "مینار پاکستان" پر جو رائے لکھی۔ وہ ان کی کتاب کے فلیپ پر موجود ہے۔ انہوں نے رشید احمد صدیقی کی رائے تو درج کر دی مگر نام نہ لکھا۔ جیسے وہ کوئی اہمیّت والی بات نہ ہو۔ دیکھا آپ نے ان کا کرّوفر، جب نشہ طلوع ہوتا ہے تو یونہی ہوتا ہے۔ یہ راز کی بات مجھے اس لیے معلوم ہے کہ وہ خط جس میں یہ رائے درج تھی۔ میرے پاس آیا تھا۔ یا یہ کہ میرے نام آیا تھا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے اب تک جتنی باتیں کی ہیں۔ وہ بلا دلیل

کہیں یا یہ کہ اپنی ذات کے حوالے سے کہیں۔ لیجیئے صاحب! دلیل بھی حاضر ہے۔ وہ بھی ایک معتبر حوالے سے، جن دنوں یہ بہاول پور میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ اُن دنوں وہاں جو کمشنر تھے وہ بھی اپنے مہربان تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا۔ مسعود صاحب! ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں؟ آپ کو کوئی شکایت تو نہیں؟ انہوں نے جواب میں مسکرانا اور صرف اتنا ہی کہنا مناسب سمجھا۔ "یہ تو آپ کے بھی علم میں ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ کسی کو عقلمند نہیں سمجھتے۔ باقی سب خیریت ہے۔"

میری ان سے دوستی کیوں ہے؟ جب اپنے ضمیر کو ٹٹولا تو معلوم ہوا بُرائیاں مشترک ہیں۔ ابتدائی داستان تو مختلف ہے۔ موجودہ یہ ہے کہ اُوپر خُدا کو خُدا اور نیچے اپنے آپ کو خدا سمجھنا۔ دھوپ چھاؤں کی کیفیت یوں بھی کہ کبھی اپنے آپ کو اتنا عاجز ظاہر کرنا کہ اصلی خُدا نے بھی ہمیں شک کی نظر سے دیکھنا۔

مجھے ایک بار مسعود نے کہا تھا کہ کسی نے مشتاق یوسفی کے بارے میں ایک خوبصورت فقرہ لکھا ہے کہ "ہم مزاح کے عہدِ یوسفی میں جی رہے ہیں"۔ بے شک فقرہ خوبصورت ہے مگر میرا دھیان ایک اور طرف نکل گیا۔ اس لیے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ بڑے ادب کا تعلق عہد سے نہیں ہوتا، بلکہ ہر عہد سے ہوتا ہے۔ کیوں کہ بڑا ادب ماضی وحال کے ادب کی کاٹ ہوتا ہے۔ یہ سوچتا تھا کہ اُردو کے بڑے بڑے نثر نویسوں کے نام ذہن میں گھوم گئے۔ میرامن جنہوں نے ترجمے میں نام پیدا کیا۔ رتن ناتھ سرشار جنہوں نے قصّہ گوئی میں مقام حاصل کیا۔ مولوی نذیر احمد جنہوں نے مذہب میں دخل دیا۔ ابوالکلام آزاد جنہوں نے عربی نثر میں اُردو کے الفاظ سجائے۔ محمّد حسین آزاد جنہوں نے جو چاہا لکھ دیا اور جیسا

چاہا لکھ لیا۔

اگر آپ اس کو بڑا بول نہ سمجھیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ ان سب کا عکس مختار مسعود کی تحریر میں ہے۔ بات صاف کر دوں کہ میں انہیں، ان ادیبوں کا مثیل قرار نہیں دے رہا بلکہ یہ عرض کر رہا ہوں کہ ان کی تحریر میں میر امّن کا علم مستعار بھی ہے۔ سرشار کی قصّہ گوئی بھی ہے۔ مولوی نذیر احمد کا مذہبی ٹچ بھی ہے۔ ابوالکلام آزاد کا شکوہ بھی ہے۔ محمد حسین آزاد کی لفّاظی بھی ہے۔ پھر احساس یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے فقروں کو، جتنی بار انہوں نے خراد پر چڑھایا ہے۔ اُتنی بار کسی بھی نثر ساز نے نہیں چڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں جو بندھ گیا سو موتی والا معاملہ نہیں بلکہ جو بندھے وہ موتی ہو والا قصّہ ہے۔

چونکہ یہ تقریب مختار مسعود کی کتاب "آواز دوست" کی رُونمائی کے سلسلے میں ہے اس لیے صاحبِ کتاب کی نقاب کشائی کے ساتھ ساتھ اگر اس کتاب کو بھی اُلٹ پلٹ کے دیکھ لیا جائے تو کچھ زیادہ نقصِ امن کا خطرہ پیدا نہ ہوگا۔ حالانکہ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ کسی دوست کے بارے میں باتیں کرنا (خواہ وہ مفرّح قسم کی کیوں نہ ہوں) کسی طرح سے بھی جرمِ خفیفہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے دوستی کے دربار میں جُرم اتنا بڑا دھچکا نہیں ہوتا جتنا کہ اقبالِ جُرم، بہرحال میں جملہ احتیاطی تدابیر کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ اس کتاب کا پہلا مضمون "مینار پاکستان" ہے۔ جو ہے تو اپنے مینار کے بارے میں، مگر انہوں نے تو مُوم ڈالا ہے دُنیا جہان کے میناروں کو، جیسے جیسے یہ اِدھر اُدھر پکے ویسے ویسے انہوں نے ہمارے ذہنوں کو بھی گھُما ڈالا یعنی علم کے بوجھ سے ایسا چکرایا کہ بے سُدھ کر دیا۔ جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ یہ مضمون صرف مینارِ پاکستان پر نہیں بلکہ تاریخِ پاکستان پر بھی ہے۔ المیہ

یہ ہے کہ جنہوں نے پاکستان کی تاریخ کو بنایا تھا۔ یا جو حالات کی چکی میں پسے تھے۔ اُن کی تو زبانیں گُنگ اور چہرے فق ہیں۔ جنہوں نے نہ مشاہدہ کیا تھا اور نہ مجاہدہ ۔ وہ گفتار کے غازی، خدا بن بیٹھے ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے صرف ہمیں ہی نہیں تڑپایا، بلکہ خود بھی تڑپے ہیں۔ اسلاف کے کارناموں کو یاد ہی نہیں دلایا بلکہ کچھ کرنے پر بھی اُکسایا ہے ۔

مجھ میں کئی بُرائیاں ہیں (الحمد للہ) جن میں کئی اچھائیاں ہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ پریشان ہیں کیوں کہ وہ اپنی پہچان رکھتے ہیں اور خود احتسابی ضمیر کے لیے اتنی بڑی سزا ہے۔ جیسے زندگی کی پُل صراط سے ہر دم گزرنا، پھر جہاں بات علم کی ہو وہاں کے متعلقات تین ہیں۔ طلبِ حق، استدلال اور ایمان، مجھے "مینارِ پاکستان" میں تینوں ہی حقیقتوں کا سراغ ملا۔ قبل اس کے کہ میں اس مضمون کے بارے میں، مزید کچھ کہوں آپ کو اس کتاب کے چوبیسویں صفحے کی چند سطریں پڑھوانا چاہتا ہوں:

"اس برّصغیر میں عالمگیری میناروں کے بعد جو پہلا اور اہم مینار مکمل ہوا ہے وہ مینارِ پاکستان ہے۔ یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں مگر ان کے درمیان یہ ذرا سی مسافت جن میں سکھوں کا گُردوارہ اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہیں۔ تینوں صدیوں پر محیط ہے۔ میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا اُن گمشدہ صدیوں کا ماتم کر رہا تھا۔ مسجد کے مینار نے جھک کر میرے کان میں راز کی بات کہہ دی۔ جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں۔ جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے۔ ملک کی

بجائے مفاد اور ملت کے بجائے مصلحت عزیز ہو اور جب مسلمانوں کو
موت سے خوف آئے اور زندگی سے محبت ہو جائے تو صدیاں یوں
ہی گم ہو جاتی ہیں۔"

یہ کیفیت اور یہ انداز ہے ان کے پہلے مضمون "مینار پاکستان" کا، اس مضمون میں دردمند لہجے کی ایک عجیب سی مہک ہے۔ جو صفحہ بہ صفحہ نہیں بلکہ سطر بہ سطر محسوس ہوتی ہے۔

اب آئیے ان کے مضمون "قحط الرجال" پر، یہ مضمون دراصل میرے خلاف لکھا گیا ہے۔ میرے خلاف اس طرح کہ میں جو شخصیتوں پر مضمون لکھا کرتا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ ایک مضمون اسے بھی لکھ کر دکھایا جائے تاکہ عبرت پکڑے اور قلم رکھے۔ چونکہ اہلِ قلم اس قسم کے تاؤ میں نہیں آتے۔ اس لیے ان کا بھی وار خالی گیا۔ اگر ہم اس قسم کے قلمی غصے میں آنے والے ہوتے تو غالب کی موجودگی میں ذوق کو شعر کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ حالی کے زمانے میں نوح ناروی کو شعر کہنے کی کیا ضرورت تھی؟

اس مضمون کے سلسلے میں الحمد للہ والی بات، ایک یہ بھی ہے کہ یہ ایک تاثراتی مضمون ہے جس کا شخصیت نگاری سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے دوسروں کو اُجاگر کرنے کی بجائے اپنے علم کو زیادہ انڈھیل دیا ہے۔ انہوں نے جس شخصیت پر بھی قلم اُٹھایا اُسے تو رکھا پس منظر میں، لیکن بہانے بہانے سے، اپنی تصویر کو شوخ رنگوں میں اُبھار دیا۔ اِس مضمون میں خودنمائی کا ایک ایسا چکر ہے۔ جس کی زد میں راجہ محمود آباد بھی آئے۔ غریب چواین لائی بھی، حتیٰ کہ ڈاکٹر اقبال بھی، جہاں تک اس

مضمون سے موصوف کی تصویر اُبھرتی ہے وہ بے شک ہے تو شوخ ڈھنگ مگر ہے اپنی جگہ حد درجہ دلآویز، خدا کرے کہ یہ اسی نوع کے اور مضامین بھی لکھیں تاکہ اُن سے ان کا سراغ تو ملے۔ اس مضمون میں، بڑی شخصیتوں سے مسعود کا برتاؤ ویسا ہی ہے جیسا کہ قائد اعظم کا سر سکندر حیات سے تھا۔ ویسے اس مضمون کا ابتدائی حصّہ بڑا خوبصورت ہے جسے بھلا دینا آسان نہ ہوگا۔ پروازِ تخیل کے ساتھ، کلمات کی کھنک اور لہجے کی لچک سے مرعوب ہونا ہی پڑتا ہے۔ اس پہ ان کے وسعتِ مطالعہ کا چھڑکاؤ، واہ وا اور سبحان اللہ والا قصّہ ہے۔

آیئے اب پھر ناک کی سیدھ میں چلیں۔ یعنی ان کی شخصیت پر باتیں کریں کیونکہ اپنے قلمرو کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

یہ زاہد خشک نہیں بلکہ طبیعت مفرّح پائی ہے۔ فقرے کستے ہیں۔ فقرے سنتے ہیں۔ کئی لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خود ایک فقرہ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ میرا خیال ایسا نہیں ہے۔ اگر میرا بھی ایسا ہی خیال ہوتا تو میں کبھی ان پہ مضمون نہ لکھتا۔ کیوں دُوری مُول لیتا؟ جب یہ خود دوسروں کو رگیدتے ہوں تو پھر اپنے بارے میں میٹھے بول کیوں نہیں سُن سکتے؟

ایک دن یہ ہمیشہ کی طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ کہہ رہے تھے۔ مجھ پہ فلاں ادیب نے مضمون لکھا ہے۔ فلاں شاعر نے مضمون لکھا ہے اور فلاں صاحب لکھنے والے تھے کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ اس پر میں نے چپکے سے سوال کر دیا۔ "ہارٹ اٹیک آپ کی کتاب پڑھنے سے پہلے ہوا تھا کہ کتاب پڑھ کر ہوا؟"

زاہد خشک سے یاد آیا کہ میں گذشتہ سال رمضان المبارک میں، ان کے ہاں تھا۔

میں لاہور سے چل دیا تو مجھے راستے میں معلوم ہوا کہ رمضان کا چاند نکل آیا ہے۔ جب میں ان کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ مسعود تراویح پڑھنے گئے ہیں۔ اُس وقت میں نے سوچا کہ بُرے وقت گھر سے نکلا اور بُرے شخص کے ہاں پھنسا!

چنانچہ جب مسعود تراویح پڑھ کر واپس آئے تو انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا: "روزہ رکھنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

مَیں نے جواب میں کہا: "جو لوگ روزہ رکھتے ہیں وہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔"

انہوں نے وضاحت چاہی: "آپ کا شمار اچھے لوگوں میں ہے کہ نہیں؟"

میں نے عرض کیا: "میرا شمار بھی اچھے لوگوں میں ہوتا لیکن ڈاکٹروں نے منع کر رکھا ہے کہ اچھا آدمی بننے کی کوشش نہ کرنا۔"

"پھر؟"

"مجھے اچھا آدمی نہ بنائیے گا۔"

مسعود نے کہا: "تم ڈاکٹر کی بات تو سنتے ہو مگر میری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہو۔"

"فرمائیے"؟

"میں سحری کے وقت دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ لہٰذا ———"

چنانچہ صاحب! میں جتنے دن ان کے ہاں رہا۔ اُتنے ہی روزے رکھنا پڑے چنانچہ اس عید پر جب بھابی اور مسعود ملنے کے لیے آئے تو بھابی نے کہا: "اب کے رمضان میں آپ کو بہت یاد کیا۔"

"کیوں روزے رکھوانا تھے؟"

اُن کی دیانت داری اور اصول پرستی کا بھی شہرہ ہے۔ کہتے ہیں کہ نیکی اور سچائی کو جاننا بھی اچھا ہے لیکن اس کو پسند کرنا زیادہ اچھا ہے اور اس پر عمل کرنا سب سے اچھا، یہ ہمہ وقت "سب سے اچھا" کے چکر میں رہتے ہیں۔ ایک بار ان کی اصول پرستی کی زد میں، ان کا ایک رشتہ دار آیا، دوسری مرتبہ اس خاکسار کا ایک رشتہ دار! باقیوں کا حال اللہ جانے!

مَیں ان کے رشتہ دار کا قصّہ تو بیان نہ کروں گا تاکہ یہ کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھا دی۔ البتّہ دوسرا قصّہ بیان کرتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا "میرا ایک عزیز ہے جو بیکار ہے۔ آپ کا محکمہ نمک کے پرمٹ بانٹتا ہے۔ اگر ایک پرمٹ میرے عزیز کو بھی مل جائے تو اُس کی دال روٹی کا بندوبست ہو جائے گا۔"

میری عرض داشت کے جواب میں، انھوں نے کہا بلکہ فرمایا "میں آپ کو اس بات کا جواب پندرہ بیس روز کے بعد دوں گا۔" چنانچہ 'عدّت' کے دن گزر جانے کے بعد یہ بتایا کہ اب نمک کے پرمٹ نہیں ملا کریں گے۔ بلکہ نمک نیلام ہوا کرے گا۔"

اس پر میں نے کہا "اتنے سے جواب کے لیے اتنی مہلت کیوں مانگی تھی؟"

کہنے لگے "جب آپ نے مجھ سے بات کی تھی۔ اُن دِنوں پرمٹ سِسٹم ہی تھا۔ میں آپ کو پرمٹ دلوا سکتا تھا۔ ہامی اس لیے نہیں بھری تھی کہ میں ذاتی طور پر پرمٹ سِسٹم کے خلاف تھا۔"

یہ بڑے بااصول آدمی ہیں۔ لیکن اصول ان کے کچھ اپنے ہی ہیں اور زیادہ تر

اپنے ہی زد میں آتے ہیں۔ جو شخص جواز اور عدمِ جواز کی اخلاقی حیثیت کو اپنے دلائل سے ثابت کر سکتا ہو وہ بڑا چالاک شخص ہے۔ ایسے مفہوم میں یہ بھی ایسے ہی "سیدھے چالاک" ہیں۔

اِن کا حافظہ بڑا اچھا ہے۔ جو چیز ایک بار پڑھ لیتے ہیں۔ وہ یاد رہتی ہے۔ پھر اپنے مطالعہ کا استعمال بھی بروقت کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہمہ وقت رُعب ڈالنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ گفتگو بھی دل نشین، لہجہ بھی طلسم و حیرت کا سماں باندھنے والا، لہٰذا مخاطب مار کیوں نہ کھائے؟

ایک دفعہ انہوں نے ایک ادبی نشست میں تقریر کی، وہ تقریر ایسی نپی تُلی اور جامع تھی کہ کیا کوئی لکھ کر کرے گا۔ سبھی متحیر ہوئے۔ خُوب داد ملی۔ مارے خوشی کے ہم بھی اُچھلے، اُس تقریر کے بعد، اُن کے ایک بے تکلّف دوست نے کہا "خُوب ہی تقریر، کوئی لفظ آگے پیچھے نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ فل اسٹاپ اور کومے تک کا لحاظ رکھا۔ میری ایک بات مانو۔"

"وہ کیا؟"

"اس تقریر کے حفظ کرنے سے بہتر یہ تھا کہ تم قرآن کا ایک آدھ پارہ حفظ کر لیتے تاکہ ثواب تو ملتا۔"

انہیں ایک للک ہے۔ اور وہ للک یہ ہے کہ کچھ کرنا چاہیئے۔ بہت کچھ کیا بھی ہے اور بہت کچھ کرنے کے ارادے ہیں۔ جیسے ان کا خیال یہ ہو کہ مجھے دوسرے افسروں کی طرح قزوینی نہیں بننا چاہیئے۔ قزوینی کا قصّہ کیا ہے؟ جیسے میں نے سُنا، ویسے

ہی آپ کو سنائے دیتا ہوں۔

قزوین میں عام رواج ہے کہ لوگ اپنے جسموں پر طرح طرح کی تصویریں سوئی سے گدواتے ہیں اور اس میں کبودی رنگ بھرواتے ہیں۔ یہ نقش پھر عمر بھر جلد سے نہیں مٹتا۔ ایک قزوینی حجام کے پاس گیا اور کہا کہ میرا ستارہ طالع اسد ہے۔ اس لیے میرے جسم پر شیر کی تصویر بنا دو۔ مجھے خدا نے شیر کی سی شجاعت کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ شیر کی تصویر میری باطنی شجاعت کی ظاہری علامت ہوگی اور میں اس کی بدولت رزم و بزم میں قوی پشت رہوں گا۔ اور یہ نقش میرے کندھے پر بنا دو۔"

جونہی حجام نے سوئی چبھو کر تصویر کشی شروع کی تو قزوینی چیخنے لگا کہ "مار ڈالا۔ تھم جاؤ۔ بتاؤ کہ شیر کے کس حصّے کی تصویر شروع کی ہے؟" اُس نے کہا "دُم سے آغاز کیا ہے!" قزوینی نے کہا "اِس دُم نے تو میرا ناک میں دم کر دیا۔ بھائی دُم کی ایسی کیا ضرورت ہے۔ کوئی اور حصّہ بناؤ۔"

حجام نے پھر کسی اور جگہ سے شروع کیا۔ پھر سوئی چبھنے سے قزوینی چلّایا کہ اب کیا بنانے لگے ہو۔ اس نے کہا "شیر کا کان!" "بھئی چھوڑو اس کا کان! اس سے تو جان نکل گئی۔

پھر اُس نے شکم بنانا شروع کیا۔ قزوینی کے لیے پھر درد ناقابلِ برداشت تھا۔ کہنے لگا۔ چھوڑو اس پیٹ کو بھی،

اس پر حجام حیران و انگشت بدنداں، سوئی چھوڑ کر بیٹھ گیا اور کہا "بے دُم و بے گوش و شکم تو خدا بھی نہ بنا سکا۔ میں بھلا کیا بناؤں گا؟"[1]

یہی حال افسران کا ہے۔ کبھی وہ ایک انقلابی قدم اُٹھاتے ہیں۔ کبھی دوسرا، یوں

---

[1] ملفوظاتِ رومی

قوم کی نہ دُم بنتی ہے ۔ نہ کان کھڑے ہوتے ہیں اور نہ ہی شکم سیر ہوتا ہے ۔ مَیں آپ کو یہ قصّہ نہ سناتا ۔ لیکن مَیں کیا کروں ، مسعود کو قصّہ گوئی سے رغبت ہے ۔ بہر حال مسعود ایسے لوگ غنیمت ہیں کہ جو ابھی انگارہ ہیں ۔ اگر ان میں سے بھی دہکنے کی کیفیت ختم ہو گئی تو پھر کیا ہو گا ؟

بعض اوقات ان کی کسی حرکت سے جو اندازہ ہوتا ہے ۔ وہ کچھ غلط ہی بیٹھتا ہے ۔ ہم سوچیں گے کہ ان کے دل میں جو بات آئی ہے وہ کچھ یوں ہو گی یعنی ہم جو سوچیں گے وہ کچھ زیادہ مائل بہ اچھائی نہ ہو گا ۔ مگر جب یہ خود کچھ دنوں کے بعد اُسی بات پر روشنی ڈالیں گے تو وہ بات بڑی خوبصورت ہو گی ۔ یہ شخص اپنی اچھائیوں کا بھی علم نہیں ہونے دیتا ۔ انہوں نے اپنی ذات پر اتنے خول لاد رکھے ہیں کہ اصل آدمی چھُپ گیا ہے ۔ جو کہ بہت پیارا ہے ۔

سُنا ہے کہ انہیں غصّہ کم آتا ہے مگر یہ بات اتنی کٹیلے انداز میں کر سکتے ہیں کہ پھر چیخنے چلاّنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی ۔ آپ کے ان سے مراسم ہوں اور یہ اچانک چُپ ہو جائیں تو سمجھ لیں ۔ انہیں آپ سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے ۔ غرض یہ دوسروں کو بدگمانیوں میں مبتلا کرانے میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے ۔

انہوں نے اپنے والد کی درویشی کو نہ اپنایا بلکہ اس سے "سبق" حاصل کیا کیونکہ وہ دنیا کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے ۔ وہ قصداً گوشہ نشین تھے ۔ یہ عمداً محفلوں کی جان بنے ۔ وہ کم گو تھے ۔ انہوں نے برملا کہا ۔ میری باتیں سنو ۔ وہ میلے کپڑوں میں بھی اپنے آپ میں مست تھے ۔ انہوں نے خوش لباسی کو اپنا شعار بنایا ۔

انہوں نے نہ صرف اپنی سیرت کو سنوارا بلکہ اپنی صورت کو بھی بنایا۔ یوں یوسف ثانی تو نہ بن سکے۔ جوانِ رعنا ضرور کہلوایا۔ وہ کیسے؟ وہ ایسے کہ گھڑسواری کی۔ اور میلوں ہی زمین کو روند ڈالا۔ تیراکی کی تو پانی کو ہرایا۔ بیڈمنٹن کھیلی تو ساتھیوں کو نیچا دکھایا۔ غرض ہر طرح سے اپنے آپ کو سنوارا۔

نوک دار مونچھیں بنانے میں بھی حد درجہ احتیاط برتی۔ ورنہ ذراسی مونچھوں کا اُڑ جانا کون سی بڑی بات ہے۔ دراصل مونچھوں کا اُونچا رکھنا ہی، ان کی زندگی کا اصل چلن ہے۔ جو کام بھی کریں گے اُسے انتہا تک پہنچانے کی سعی کریں گے تاکہ مونچھ اُونچی رہے۔ یہ ڈھلمل یقین لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ ان کا ایمان یقین کی استواری پر ہے۔ پھر ان کے خیالات وجذبات میں ایک عجیب قسم کی طہارت ہے۔ باتوں میں گلوں کی خوشبو ہے۔ مختصر یہ کہ انسانوں کا خدا، انسانوں ہی کے ذریعے انسانیت کی سرپرستی کرتا ہے۔ خواہ روپ مختار مسعود کا ہو یا کسی اور کا!

میں اپنی بات پھر دہرادوں کہ یہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اگر کسی کو کچھ سمجھتے ہیں تو وہ بندے کی ذات نہیں خدا کی ذات ہے۔ اتنا منہ زور شخص اللہ کے حضور اتنا موم بھی ہوگا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ ایک بار سجدے میں گرے تو سر نہ اُٹھے۔ سر اُٹھے تو دل پھر سجدے پر مجبور کرے۔ دیکھئے کہ مسجدِ شہداء، ان کی پیشانی پر، اُسی سجدے کا نشانِ منور ہے اور مینارِ پاکستان اُسی سجدے کی گواہی اور اب "آوازِ دوست" انہی سجدوں کا ثمر!

بیشتر لوگ بے وقوف نہیں ہوتے۔ لیکن انہیں بے وقوفی کا لبادہ اوڑھنا پڑتا

ہے ۔ میرا حال یہ ہے کہ اس مضمون کے سلسلے میں، لبادہ اوڑھا بھی ہے اور بیوقوف بنا بھی ہوں ۔ جس کے گواہ آپ سب ہیں ۔ جس شخص کی گواہی میرے خلاف ہوگی ۔ وہ مختار مسعود ہوں گے ۔ اکیلے مختار مسعود!

آخری کلمہ یہ کہ یہ اُن لوگوں میں سے نہیں جو خدا سے مرادیں مانگتے ہیں بلکہ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو صرف عمل کی توفیق مانگتے ہیں ۔ کیوں کہ مرادیں عمل سے مربوط ہیں ۔

صاحب
جناب
آپ
محترم
مکرّم
معظم

